ہندستان میں
دعوت حق کے چراغ

متین طارق باغپتی

ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خواجہ معین الدین اجمیریؒ

ہندستان ایک بڑا ملک ہے۔ قدرت نے اس کو پھل پھول، غلّہ اناج اور میووں کی نعمتیں عطا کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ یہ ملک قیمتی چیزوں، ریشمی کپڑوں اور مسالوں کے لیے ہمیشہ سے دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اس کو سونے کی چڑیا کہتے تھے۔

ان نعمتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہاں کے رہنے والے اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتے اور اس کے مخلص بندے بن کر زندگی گزارتے۔ لیکن دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جب کہیں دولت کی بہتات ہوتی ہے تو لوگ غفلت کی دل دل میں پھنس کر اپنے خالق کو بھول جاتے ہیں اور ایسے کام کرنے لگتے ہیں، جس سے انسانیت کا وقار پامال ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا کی رحمت آخری وقت تک اپنے بندوں کو بچانا چاہتی ہے، اس لیے جب کبھی انسان نے خدا سے بغاوت کی اور اس کی مرضی کے خلاف راستہ اختیار کیا تو اس نے کسی بلند کردار انسان کو پیدا کیا تا کہ انسان غلط روش کے انجام سے آگاہ ہو جائے۔

آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے ہندستان میں یہی کیفیت تھی۔ اس وقت لوگ اپنے پیدا کرنے والے کو بھول چکے تھے۔ ہر طرف کفر و شرک کا بازار گرم تھا۔ جگہ جگہ بتوں کی پوجا ہو رہی تھی۔ اللہ کو ان کی حالت پر رحم آیا اور اس ملک کی اصلاح کے لیے خواجہ معین الدین اجمیریؒ کو یہاں بھیجا۔ جنھوں نے ہزار مخالفتوں کے باوجود حق کا چراغ روشن کیا اور دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کر کے یہاں کے لوگوں کو دین کا سیدھا راستہ دکھایا۔

خواجہ معین الدینؒ حضرت علیؓ کی اولاد میں تھے۔ ایران کے ایک قصبہ سنجر میں ۱۱۴۲

میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد غیاث الدین حسن سنجری ایک صاحب ثروت انسان تھے۔انھوں نے آپ کی پرورش بڑے ناز ونعم سے کی لیکن ابھی وہ چودہ ہی برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ورثے میں ایک وسیع باغ اور ایک پن چکی ملی جن کی آمدنی سے وہ فارغ البالی کے ساتھ گزر بسر کرنے لگے۔اپنی شیریں زبانی اور بلند اخلاق و کردار کے باعث پورے شہر میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

چوں کہ شروع ہی سے ان کا مزاج درویشانہ تھا اس لیے دنیوی آرام و آسایش میں دل نہ لگا اور آخر گھر، باغ اور چکّی فروخت کر کے سیاحت کو نکل پڑے۔ پہلے سمرقند میں جا کر علوم ظاہری کی تکمیل کی پھر مختلف شہروں میں پہنچ کر اس وقت کے بڑے بڑے ارباب علم و فضل سے فیض حاصل کیا، جن میں حضرت عبد القادر جیلانیؒ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد حج کے لیے رخت سفر باندھا۔ دوران سفر میں صوبہ نیشاپور کے قصبہ ہارون میں آپ کو خواجہ عثمان ہارونی کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا۔طبیعت کے میلان کے سبب آپ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور بیس سال ان کی خدمت میں صرف کیے اور ان سے بھرپور فیض حاصل کیا۔اس کے بعد اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ ایک مرتبہ حج کو بھی گئے وہیں سے ان کو خواب میں ہندستان جانے کا اشارہ ملا۔

اس زمانے کے دشوار گزار راستوں اور پر خطر سفر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔نہ سواری کا معقول انتظام نہ اتنے طویل سفر کے لیے کچھ ساز و سامان۔لیکن خواجہ صاحبؒ نے ان مشکلات کی کوئی پروا نہ ان کا نصب العین اللہ کی رضا تھا۔مصائب و مشکلات تو راہ حق کے سنگ میل ہیں چناں چہ انھوں نے اللہ کے بھروسے پر ہندستان کے لیے رخت سفر باندھا اور پشاور ہوتے ہوئے لاہور پہنچے،اس کے بعد اجمیر کا رُخ کیا۔ان کے ساتھ چالیس درویش اور بھی تھے۔سب جا کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔وہ سرکاری اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی اس لیے لوگوں نے منع کیا تو وہاں سے اٹھ کر انا ساگر پر جا بیٹھے۔

یہاں ان دنوں چاروں طرف کفر و شرک کا بازار گرم تھا۔لوگ اپنے انجام سے بے خبر لہو و لعب میں مست زندگی گزار رہے تھے۔جاہلیت نے پورے معاشرے کو گھیر رکھا تھا اور اخلاقی

انحطاط ہر طبقے میں عام تھا۔ خواجہ صاحبؒ نے بہت جلد سمجھ لیا کہ یہ ساری بیماریاں شرک کے لگے ہوئے روگ کی وجہ سے ہیں۔ اسی لیے یہ اپنی اغراض و خواہشات کے بندے بنے ہوئے ہیں شیطان کا یہ سب سے بڑا حربہ ہے جس میں یہ پھنسے ہوئے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ ان کو توحید و آخرت کی دعوت دی جائے تاکہ یہ صحیح طریقے سے زندگی گزار سکیں۔

خواجہ صاحبؒ بڑے رحم دل، نرم مزاج اور با اخلاق بزرگ تھے۔ سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے، موٹا جھوٹا پہنتے اور ہر وقت قرآن پاک کی تلاوت نیز عبادت الٰہی میں لگے رہتے تھے۔ فقیر سمجھ کر ہر شخص ان سے ملنے آتا وہ اس کو نیک کام کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے اور سمجھاتے کہ اس کائنات کا بنانے والا اللہ ہے، وہی ہوا چلاتا ہے، فصلیں پکاتا ہے اور ہمیں کھلاتا پلاتا ہے۔ پتھر کے بت تو اتنی بھی طاقت نہیں رکھتے کہ اپنے اوپر بیٹھی ہوئی مکھی کو ہی اڑا سکیں اس لیے ہمیں اللہ کو ہی اپنا مالک سمجھنا چاہیے، اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔

اسی کے ساتھ خواجہ اجمیری نے ہر آنے والے کو یہ بھی سمجھایا کہ یہ زندگی چند روزہ ہے موت کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ پھر ایک وقت آئے گا جب اللہ رب العزت تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ ان سے ان کے اچھے برے کاموں کا حساب لے گا۔ اچھے کام کرنے والوں کو جنت ملے گی اور برے کام کرنے والے دوزخ میں ڈالے جائیں گے، جو ایک برا ٹھکانہ ہے۔ اس وقت ایسے لوگوں کو اپنی ناعاقبت اندیشی پر افسوس ہوگا کہ ہم نے دنیا کی عارضی عیش کی خاطر آخرت کا دائمی نفع کھو دیا۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یہاں آدمی چاہے جتنا سامان اکٹھے کرے مگر موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہر چیز سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ موت کی سرحد کے اس پار کچھ نہ لے جا سکے گا وہاں اگر کچھ کام آ سکے گا تو ایمان باللہ۔

یہ گفتگو اتنی سادہ اور شیریں ہوتی تھی کہ دور دور سے کھنچ کھنچ کر لوگ خود بہ خود خواجہؒ کی خدمت میں آنے لگے اور اسلام قبول کرنے لگے۔ خواجہ صاحبؒ کے پاس نہ ملک و مال تھا نہ حکومت بس ایمان کی طاقت تھی اور اعلائے کلمۃ الحق کا بے پناہ جذبہ اور اللہ کے بندوں کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی تڑپ، جس کی وجہ سے وہ دن رات لوگوں کو سمجھا کر سچائی کا راستہ دکھا رہے تھے۔

لیکن جس طرح اندھیرے کو روشنی کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا وہ اپنی طاقت سے اس پر یورش کر کے اس کو ختم کرنا چاہتا ہے اسی طرح اللہ کے نافرمانوں کی بھی ہمیشہ یہ فطرت رہی ہے کہ حق کا راستہ روکیں۔ کوئی شخص برا کام کرنا چاہے تو ان کی ہمدردیاں، ان کے مشورے، ان کی ہمت افزائیاں، ان کی رعایتیں، ان کی سفارشیں اور ان کی تعریفیں سب کچھ ان کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ دل و جان سے خود بھی اس برے کام میں شریک ہوں گے اور دوسروں کو بھی اس کام میں حصہ لینے کی ترغیب دیں گے اور ان کی ہر ادا سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس برائی کے پروان چڑھنے سے ان کے دل کو راحت اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ بہ خلاف اس کے کوئی بھلا کام ہو رہا ہو تو اس کی خبر سے ان کو صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے تصور سے ان کا دل دکھتا ہے۔ اس کی تجویز تک ان کو گوارا نہیں ہوتی۔ اس کی طرف کسی کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر ان کی روح بے چین ہو جاتی ہے۔ ان کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ہر تدبیر سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس نیکی سے باز آجائے اور باز نہ آئے تو اس کام میں کام یاب نہ ہو۔

خواجہ معین الدین کے عہد میں بھی کچھ لوگ اسی فطرت کے تھے۔ ان کو خواجہ صاحبؒ کا لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا اچھا نہ لگا وہ خود گندے دل گندے دماغ کے لوگ تھے انھیں اپنے سماج میں رہتے ہوئے ایسی ہی باتیں عزیز تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری برائیوں پر کسی طرح کی حد بندی نہ عاید ہو۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جن چیزوں کی ہم پوجا کر رہے ہیں ان کو خواجہ صاحبؒ برا کہہ رہے ہیں، انھیں اس کا کیا حق ہے۔ ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کام کرتے دیکھا ہے، ہم بھی ایسا ہی کر رہے ہیں۔ صرف ایک اکیلے خدا کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی یہ بالکل ایک نئی بات ہے۔

بس ہر طرف ایک شور برپا ہو گیا۔ راجا تک یہ بات پہنچائی گئی۔ اس کی طرف سے یہ حکم ملا کہ معین الدین وہاں سے چلے جائیں مگر خواجہ صاحبؒ نے کوئی پروانہ کی۔ انھیں اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کفرزار میں وہ اللہ ہی کا کلمہ بلند کرنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد سے برابر کام کرتے رہے۔

چناں چہ ایک شخص آپ کے قتل کے ارادے سے بھی آیا لیکن آپ کی سادگی، بھولی صورت اور حق کے جلال کو دیکھ کر لرز گیا۔ پھر مختلف جتن انھیں اس جگہ سے نکالنے کے لیے کیے گئے مگر مخالفین کی کوئی پیش نہ گئی آخر کار رام دیومہنت کو اس کام میں مامور کیا گیا مگر خدا کی قدرت سامنے آتے ہی اس کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے خواجہؒ کی نصیحتیں سنیں اور ایمان لے آیا۔ اس کے بعد راجا اور چراغ پا ہو گیا۔ اس نے جے پال جوگی کو ان کے مقابلے کے لیے تیار کیا تاکہ کچھ کرتب دکھا کر وہ ان کو ڈرائے مگر وہاں پہنچ کر وہ بھی ان کی تعلیمات سن کر دم بہ خود رہ گیا اور بالآخر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

راجا کو اپنی فوجی طاقت اور جاہ وجلال کا غرور تھا۔ وہ روز نت نئے ہتھکنڈے خواجہ صاحبؒ کے خلاف استعمال کرتا رہا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ توحید کا پیغام پھیلنے نہ پائے اور کسی نہ کسی طرح خواجہ معین الدین اجمیری کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ کفر وشرک سے مصالحت کر لیں۔ اس نے اپنے عمائدین سلطنت کے ذریعے فریب اور لالچ بھی دیئے، دھمکیاں بھی دیں، مخالفانہ الزام تراشیاں بھی کیں۔ غرض وہ سب کچھ کیا، جو کسی انسان کے عزم کو شکست دینے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

مگر یہ سراسر اللہ رب العزت کا بخشا ہوا ثبات تھا، جس کی بہ دولت خواجہ صاحبؒ حق وصداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور بڑے سے بڑا حربہ بھی انہیں بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ فقیر لوگ اللہ کے محبوب اور انبیاء کے وارث ہوتے ہیں، وہ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانا چاہتے ہیں، وہ ان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب خدا کے بندے ہیں اس لیے انھیں تمام معاملات میں اسی کی بندگی کرنا چاہیے۔

خواجہ صاحب میں بھی یہی جذبہ کام کر رہا تھا۔ وہ شرک و بت پرستی کی فضا کو بدلنا چاہتے تھے اور تنہا ہوتے ہوئے بھی کفر کی یلغار کا مقابلہ کر رہے تھے۔ جنگل کے پتے اور پھل پھول کھا کر دن گزار رہے تھے لیکن جب شیطان کے گرگے زیادہ ہی خرابی پر اتر آئے تو انھوں نے اللہ سے دعا کی۔ اللہ نے محمد غوری کو راجا کی سرکوبی کے لیے ہندستان بھیجا۔ پہلے حملے میں سلطان ہار گیا مگر دوسرے حملے میں اس کی فتح ہوئی۔ راجا کا غرور ٹوٹا۔ وہ بے پناہ لشکر لے کر نکلا تھا مگر زندہ گرفتار ہو کر موت کے گھاٹ اتر گیا۔

تبلیغی منصوبہ

اسلامی سلطنت قائم ہوجانے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے ایک زبردست تبلیغی منصوبہ بنایا۔ آفتاب حق کی کرنیں اجمیر سے نکل کر دہلی اور اطراف ملک میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ خواجہ صاحبؒ اور ان کے ساتھی دعوت اسلامی کے کام میں لگ گئے۔ جہاں بھی موقع لگتا لوگوں کو سمجھاتے۔ انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی ہر ہر بستی سے اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔ بہت سے فقیر منش لوگ خواجہ صاحبؒ کے حکم سے ہندستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچے اور ہر جگہ اللہ کے دین کی تبلیغ کی۔ اپنے ایک خلیفہ کو دہلی بھیجا، جنھوں نے وہاں اپنے اخلاق عالیہ اور قوت ایمانی سے بڑے بڑے کام کیے۔

اس سلسلے میں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خواجہ صاحبؒ نے دعوت و تبلیغ کے کام کو صرف مردوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ خواتین میں بھی تبلیغ دین کا اہتمام کیا۔ اپنی صاحب زادی حافظہ جمال صاحبہ جو باپ کی تعلیم و تربیت سے اسلام کی دعوت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا چکی تھیں اور برابر ہندو عورتوں میں تبلیغ کا کام کرتی تھیں۔ ان کی تحریک سے بہت سی عورتوں نے اسلام قبول کرلیا۔

خواجہ صاحبؒ کے پاس نہ تو حکومت تھی نہ تلوار نہ اور کسی طرح کی طاقت مگر انھوں نے اللہ کے بھروسے پر ہندستان جیسے بڑے ملک میں جہاں ہر چہار طرف کفر و شرک کا غلبہ تھا اسلام کی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو اللہ کے سچے دین سے روشناس کرایا۔ اصل بات یہ ہے کہ سچائی میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور وہ اپنا کرشمہ دکھا کر رہتی ہے۔ خواجہ معین الدینؒ میں یہ صفت درجہ کمال پر تھی۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے تھے، نپی تلی بات کہتے تھے اس میں بڑا اثر ہوتا تھا۔ جو بھی سنتا ان کا گرویدہ ہوجاتا۔ بعض باتیں تو آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ فرمایا کرتے تھے:

- جو خدا کا دوست ہوگا اس میں چار صفات ہوں گی: صحبت صالحین، سخاوت، شفقت اور تواضع۔
- عارف وہ ہے، جس کا دل دنیا سے بے زار ہو۔

- انسان کو دریا کی طرح فیاض ہونا چاہیے۔
- سورج کی طرح مہربان ہونا چاہیے، جو اپنی روشنی سے امیر غریب کسی کو بھی محروم نہیں کرتا۔
- زمین کی طرح مہمان نواز ہونا چاہیے، جو اپنی پیداوار سے سب کا پیٹ پالتی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی فرمایا:

دنیا میں اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں ہے جتنا ایک انسان کا دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھنا۔

خواجہ صاحبؒ اپنے مریدوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر تم خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو انسانوں کو خوش رکھو۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسوں کو پانی پلانا اور ننگوں کو کپڑا پہنانا اور اپنے خدا کو خوش رکھنا۔ خدمت خلق خواجہ صاحبؒ کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ غریب نادار اور فقیر لوگوں کو فاقہ کشی سے بچانے کے لیے انھوں نے اجمیر میں لنگر کا سلسلہ جاری کیا، جس سے آج تک بہت سے لوگوں کو دونوں وقت شکم سیر خوراک مل رہی ہے۔

ہندستان ایسا ملک تھا جہاں قدیم زمانے سے سادھوسنتوں سے لوگوں کو عقیدت تھی حضرت خواجہ معین الدینؒ اجمیری کی صورت میں ان کے سامنے ایک انتہائی بلند اخلاق، ہمت و عزیمت کا پیکر اور خاکساری و بے ریائی کی ایسی شخصیت آئی کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ اسلام کی سیدھی سچی باتیں ان سے سنیں تو فوراً ایمان لے آئے۔ روز بہ روز مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی، جس کا سمیٹنا بھی غالباً مشکل ہو گیا ہوگا۔ کوئی باقاعدہ نظام تربیت بھی نہیں تھا، جس کے باعث ایک صالح معاشرے کی تعمیر کا انتظام نہ ہوسکا۔ اسی وجہ سے ان کے بعد بہت سی صلاحیتیں رائیگاں جاتی رہیں۔

جو لوگ خواجہ صاحب کی دعوت پر مسلمان ہوئے تھے ان کے افکار و خیالات اس حد تک بدلے کہ وہ کفر سے اسلام میں آگئے۔ لیکن چند کو چھوڑ کر اخلاق و عادات اور سیرت و کردار میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، جو اسلامی معاشرے کو مطلوب تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک عقائد کے ساتھ سماج میں عملی تبدیلیاں نہ آئیں اس وقت تک کسی صالح معاشرے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی
مجدد الف ثانیؒ

۹۲۰-۱۰۳۴ھ

آگرے کا قلعہ ماضی کی بہت سی داستانوں کا امین ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں کبھی اکبرو جہانگیر کے نام کے نقارے بجا کرتے تھے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سے راجپوت راجاؤں نے اپنی اکڑی ہوئی گردنیں خم کی تھیں۔ یہی وہ شہر ہے جہاں ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء فضلاء کی معرکہ آرائیاں ہوئی تھیں لیکن اس کی سب سے دل چسپ داستان حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت سے وابستہ ہے۔

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اکبر سے جہانگیر تک کے دور میں سجدۂ تعظیمی کا رواج عام تھا۔ دربار میں آنے والے ہر شخص کو بادشاہ کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ صرف اکیلی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت تھی، جس نے سجدۂ تعظیمی کے خلاف شریعت محمدیؐ کی حمایت کی اور دربار شاہی میں پہنچ کر بھی بادشاہ کے سامنے سر نہیں جھکایا کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کے لیے صرف اللہ رب العزت کے سامنے ہی جھکنا روا ہے۔ کسی دوسرے کے سامنے سر جھکانا اسلام کی بنیادی تعلیمات کے منافی ہے۔

ہندستان میں اسلام کی آمد پہلی صدی ہجری میں اس وقت شروع ہوئی جب محمد بن قاسم

کو خلیفہ ولید بن عبد الملک نے دریائے سندھ کے بحری قزاقوں کی سرکوبی کے لیے سندھ کی فوجی مہم پر بھیجا۔ ان بحری قزاقوں نے عرب تاجروں کو لوٹ لیا تھا۔ محمد بن قاسم کو اس فوجی مہم میں شان دار کامیابی ملی اور وہ علاقے پر علاقہ فتح کرتا ہوا قنوج تک پہنچ گیا۔ اس طرح عربوں کے لیے ہندستان کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے بعد شمالی سرحدوں سے محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملے ہوئے اور فوجوں کے ہمراہ بہت سے اہل اللہ اور صوفیائے کرام یہاں تشریف لائے جن کی کوششوں سے بڑی مختصر مدت میں اسلام بنگال اور دکن کی آخری سرحدوں تک پہنچ گیا۔

ان کے علاوہ اسلام کے فروغ میں غلام خاندان کے بادشاہوں کی خدا ترسی کا بھی بڑا دخل ہے، اس دور میں شہر شہر مسجدیں تعمیر ہوئیں، بستی بستی میں مکاتب کھلے، ہر جگہ قرآن و احادیث کی تعلیم عام ہوئی اور مسلمانوں کی رواداری، بادشاہوں کے عدل و انصاف اور صوفیائے کرام کے وعظ و نصیحت کی بہ دولت لوگ مسلمان ہوتے رہے۔

اس بیچ میں دہلی کے تخت پر غلام، تغلق، خلجی اور لودھی خاندانوں کے بادشاہ یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے اور آخر ۱۵۲۶ میں کابل کے حکمراں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست فاش دے کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ لیکن بابر زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا مگر پٹھانوں اور راجپوتوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب اس کو ایران بھاگنا پڑا۔ پھر شہنشاہ ایران کی مدد سے ۱۵۵۵ میں اس نے دوبارہ ہندستان فتح کیا۔ پھر اس کی وفات کے بعد اس کا نوعمر لڑکا اکبر دلّی کا تخت نشین ہوا۔ اس نے نوعمری کے باوجود تھوڑی ہی مدت میں مالوہ، گجرات اور بنگال کو فتح کر کے پورے شمالی ہند میں اپنا اثر جمالیا۔ اس کے علاوہ اس نے نظام سلطنت میں بھی بہت سی اصلاحات کیں۔ وہ اگرچہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر علمی و ادبی معاملات سے اسے گہری دل چسپی تھی۔ فتح پور سیکری میں وہ ایسی مجلسیں منعقد کراتا تھا جن میں مختلف مذاہب کے اہل علم شریک ہوتے تھے۔

ان مجلسوں کی روح رواں شیخ ابوالفضل اور فیضی تھے۔ دونوں بھائی علم و فضل میں درجہ کمال رکھتے تھے، مگر چاپلوس اور خوشامدی بھی تھے۔ یہ انھیں کا کارنامہ تھا کہ اکبر کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ صرف شہنشاہ ہی نہیں ہے بلکہ ہادیِ دین اور امام عادل بھی ہے۔ دنیا پرست

علما نے یہ نظریہ قائم کیا کہ محمد ﷺ کی بعثت پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال تھی، اس لیے اب وہ منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرے دین کی ضرورت ہے۔ عوام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا کہ حق وصداقت اور عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں موجود ہیں لہٰذا تمام مذہب میں جو باتیں حق ہیں انھیں لے کر ایک جامع طریقہ بنانا چاہیے تاکہ لوگوں کے اختلافات مٹ جائیں اور میل ومحبت کی فضا ہموار ہو۔

دین الٰہی کی ابتدا

چناں چہ ''دین الٰہی'' کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی گئی، جس کا کلمہ تھا:

لا الہ الا اللّٰہ اکبر خلیفۃ اللّٰہ۔

جو بھی اس دین کو اختیار کرتا وہ چیلہ کہلاتا تھا۔ اس مذہب میں داڑھی منڈانا، شراب پینا جائز تھا۔ مشہور تو کیا گیا کہ اس مذہب (دین الٰہی) میں ہر مذہب کی اچھی باتیں لے لی گئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نئے مذہب کی بنیاد اسلام دشمنی پر رکھی گئی تھی اور بہت سے ایسے اقدامات کیے گئے تھے، جو سراسر اسلام کے خلاف تھے مثلاً السلام علیکم کی جگہ اللّٰہ اکبر کہا جانے لگا اور جواب دینے والا جل جلالہ کہتا تھا کیوں کہ اکبر کا پورا نام جلال الدین اکبر تھا۔ دوسری طرف جودھا بائی سے اکبر کی شادی ہونے کے بعد محل میں ہندو مذہب کا عمل دخل بھی ہو گیا تھا۔ بادشاہ خود ماتھے پر تلک لگانا، بست کا تیوہار منانا، رنگے ہوئے کپڑے پہن کر دربار میں آنا اور ہندوؤں کے میلوں ٹھیلوں میں شرکت کرتا تھا۔ شروع میں یہ سب سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا لیکن بعد میں دھیرے دھیرے ان باتوں نے اس کے مزاج کو بدل دیا اور کفر وشرک نیز فسق و فجور نے اس بری طرح اس کو اپنے نرغے میں لے لیا کہ وہ صرف نام کا مسلمان رہ گیا تھا۔ محل میں ہر وقت آگ جلائی جاتی تھی بادشاہ سورج کے ایک ہزار ناموں کا جاپ کرتا تھا۔ پھر کھڑکی میں کھڑا ہوتا تھا کہ عوام الناس درشن کے بہانے سجدۂ تعظیمی بجالائیں۔ سور کا دیکھنا متبرک خیال کیا جانے لگا۔ محل کے احاطے میں اذان ممنوع قرار دی گئی۔ اکبر دانستہ طور پر قبلے کی طرف پیر پھیلا کر سوتا تھا۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دینے کے لیے بادشاہ کی زبان کافی تھی۔

مختصر یہ کہ تمام ارکان اسلام پس پشت ڈال دیے گئے تھے اور چہار جانب الحاد کا زور تھا۔ مقام افسوس یہ تھا کہ اس فرعونی نظام کے ساتھ نہ صرف عام مسلمان لگے ہوئے تھے بلکہ علمائے سوء جبہ و دستار کے ساتھ تعاون میں مصروف تھے اور بادشاہ کے سامنے جب حاضری کا شرف عطا ہوتا تو اس کے سامنے وہ بھی سجدہ فرماتے اور صریح شرک کو سجدۂ تحیہ اور ''زمین بوسی'' جیسے الفاظ کے پردے میں چھپاتے تھے۔ جہانگیر کے دور میں بھی یہ فتنہ جوں کا توں تھا۔ بادشاہ کثرت سے شراب پیتا اور فرائض و سنن سے غافل تھا۔

یہی وقت تھا کہ شیخ احمد سرہندیؒ کو کفر و فسق کے مقابلے میں اللہ نے کھڑا کیا، جو خدا پرستی کے حقیقی جذبات سے سرشار تھے اور جنھوں نے شاہی قوت کے مقابلے میں یکہ وتنہا احیائے دین کی جدوجہد کے لیے نعرۂ حق بلند کیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے غلط ماحول اور ظلم و استبداد کے مقابلے میں نعرۂ حق بلند کرنا اور ضلالت کے تاریک ماحول میں صداقت کی مشعل جلانا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ لیکن یہ شیخ مجدد الف ثانیؒ کی جرأت مومنانہ تھی، جو بہ بانگ دہل یہ اعلان کر رہی تھی:

اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللّٰہ

یہ تو ظاہر تھا کہ شیطان نے ملت کے سواد اعظم پر بری طرح شب خون مارا تھا۔ رائج الوقت نظام نے اپنے استبداد سے کام لے کر شریعت محمدیؐ کی روح کو مسخ کرنے کا پورا اہتمام کیا تھا اور شاہی اقتدار ائمۂ کفر و ضلالت کے ساتھ مل کر حریت اسلامی کا گلا گھونٹنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ یہ وقت سوچنے اور سوچ کر بیٹھ جانے کا نہیں تھا بلکہ عشق کی مردانہ وار جرأت کی ضرورت تھی۔ سرزمین ہند کا ذرّہ ذرّہ صدائے حق کا پیاسا تھا۔ ملک کے طول و عرض میں بسنے والی سینکڑوں سعید روحیں برسوں سے پیام حق سننے کی منتظر تھیں اور لاکھوں انسان نہایت بے بسی کے ساتھ اقتدار وقت کے غلط منصوبوں کو دیکھ رہے تھے لیکن اللہ رب العزت سے اس بات کے خواست گار تھے کہ کوئی مرد حق اٹھ کر صدائے حق بلند کرے۔

شیخ احمدؒ کو اسی ضرورت کے احساس نے موت کی بازی لگانے پر مجبور کیا اور وہ غیرت ایمانی کے تقاضے سے یکہ وتنہا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے کمر کس لی۔

شیخ مجدد الف ثانیؒ مشرقی پنجاب کے سرہند نامی قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ نسبی اعتبار سے ان کا سلسلہ نسب حضرت عمرؓ سے ملتا ہے۔ والد کا نام شیخ عبدالاحد تھا۔ ان کے اجداد کابل سے ہجرت کر کے ہندستان آئے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں انھوں نے معروف طریقے سے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ دہلی کے نقشبندی بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا اسی لیے ان کا رجحان تصوف کی طرف بھی تھا لیکن پھر بھی انھوں نے وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے دعوت حق کی شمع روشن کی۔

اس وقت اگر چہ ہندستان میں مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت قائم تھی اور ان کو اس ملک میں سیاسی غلبہ اور دوسری قوموں کے مقابلے میں تفوق حاصل تھا لیکن شاہی دربار کے امراء میں غیر اسلامی شعائر مقبول رہے تھے اور جاہ پرستی ان کو دین سے بیگانہ کرتی جا رہی تھی۔ ان میں سے چاپلوس قسم کے لوگوں نے خود وضع کردہ تفسیروں، اپنے خیالی فلسفوں اور اجتہاد باطلہ کے ذریعے قوانین الٰہی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کو مٹانے کے لیے اپنی سازشوں، وسوسہ اندازیوں اور کج بحثوں سے عام مسلمانوں کو بھی ورغلانے کا کام لے رہے تھے۔

گم راہیوں کا یہ چلتا ہوا کاروبار مجدد الف ثانیؒ کے قلب پر روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ چناں چہ موصوف نے خود جہانگیر کے ابتدائی دور کا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اس دور میں اسلام کی غربت اس درجہ پہنچی ہے کہ اہل کفر اس پر راضی نہیں کہ محض کفر کے احکام کا اعلانیہ اسلامی بلاد میں اجرا ہو جائے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی احکام بالکلیّہ مٹا دیئے جائیں اور اسلام و مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام کے کسی اشعار کا اظہار کرتا ہے تو اس کو قتل کر دیا جاتا ہے۔''

(تذکرۂ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ از محمد منظور نعمانی ص: ۲۴۷-۲۴۸)

جدوجہد کی ابتدا

ان حالات کو دیکھ کر ہی آپ نے اپنی کوششوں کا دائرہ وسیع کیا اور گم راہیوں کی اصلاح کے لیے میدان میں آگئے۔ یہ ایک عظیم الشان کام تھا۔ ایک طرف تو عام مسلمانوں کی اصلاح پیش نظر تھی، جس سے ان میں دینی شعور پیدا ہو۔ دوسری طرف عمائدین سلطنت کو ان بے اعتدالیوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا، جن کے باعث مغلیہ سلطنت کی اسلامی حیثیت مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔ چناں چہ آپ نے جہانگیر کے دربار کے بہت سے ممتاز ارکان کو خطوط لکھ لکھ کر احساس دلایا کہ بھائی! مسلمان کی زندگی کے لیے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ پانی جدھر بہا کر لے جائے ادھر بہہ جاؤ اور ہنسوا، جدھر اڑائے اڑ جاؤ۔ تم مسلمان ہو مسلمان کا دین اسلام ہے اسلام تو دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہو ان سب کو چھوڑ کر مسلمان اللہ اور رسولؐ کے راستے پر چلے اور دنیا کے دوسرے انسانوں کو بھی اسی راستے پر چلنے کی تلقین کرے۔ اس سلسلے میں حضرت مجددؒ نے وعظ و تلقین سے کام لیا اور ذمہ داران حکومت کو خطوط بھی لکھے۔ ان خطوط کے ایک ایک لفظ سے اسلامی درد ٹپکا پڑتا ہے۔ دیکھیے ایک خط میں حالات پر تبصرے کے بعد کیا لکھتے ہیں:

> ''ہائے افسوس اور ہائے ہماری بربادی! پروردگار عالم کے محبوب ﷺ کے ماننے والے ذلیل و خوار ہوں اور ان کے منکروں کی عزت ہو؟ مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی تعزیت میں مصروف ہوں اور دشمن مذاق و تمسخر سے ان کے دلوں پر نمک پاشی کریں؟ ہدایت کا آفتاب پردوں میں مستور ہو اور نورِ حق باطل کے حجابوں میں چھپا ہو؟''
>
> (تذکرۂ امام ربانی مجدد الف ثانی از محمد منظور نعمانی ص: ۱۳۹)

حضرت مجددؒ نے بہ طور خاص خان اعظم نواب سید فرید اور لالہ بیگ کو جو خطوط لکھے ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ ان خطوط میں انھوں نے ایسے بلند اقبال لوگوں کو توجہ دلائی ہے جو حکومت وقت کے روح رواں تھے کہ اس نقصان کی تلافی ہونی چاہیے، جو اسلام کو اکبری عہد میں پہنچا ہے۔ چناں چہ لالہ بیگ کو اعلائے کلمۃ الحق اور خدمت دین کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بادشاہت کے شروع ہی میں اگر مسلمانی کا رواج ہو گیا اور مسلمانوں کا

کھویا ہوا وقار قائم ہو گیا تو کیا کہنے! العیاذ باللہ۔ اگر اس میں کچھ رکاوٹ یا تاخیر ہوئی تو مسلمانوں کا کام سخت دشواری میں پڑ جائے گا۔ الغیاث، الغیاث، الغیاث۔''

اسی خط کے آخر میں فرماتے ہیں:

''دیکھیں، کون ایسا صاحب دولت ہے جو اس سعادت سے فیض یاب ہوتا ہے اور کس شاہ باز کی رسائی یہاں تک ہوتی ہے۔ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے۔'' (تذکرۂ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ از محمد منظور نعمانی ص: ۱۳۹)

ایک دوسرے خط میں خان جہاں کو اسی مقصد کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہی نوکری جو تم کرتے ہو اگر اس کو آں حضرتؐ کی شریعت زندہ کرنے کا ذریعہ بناؤ تو تم گویا پیغمبروں کا کام کرو گے۔ دین متین کو روشن اور آباد کرو گے، جس سے خدا کی خوش نودی بہ اتم قریب ہے۔ ہم فقیر لوگ اگر اپنی جان بھی لگا دیں گے تب بھی آپ جیسے شاہ بازوں کی گرد تک نہ پہنچ سکیں گے۔''

(تذکرۂ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ از محمد منظور نعمانی ص: ۸-۱۴۹-۱۴)

خان اعظم خاں جو حکومت وقت کا خاص رکن اور جہانگیر کا معتمد علیہ بھی تھا، کو لکھتے ہیں:

''اس نازک وقت میں جب کہ ہمارا پلّہ کم زور ہے اور ہم بازی ہار چکے ہیں، آپ کے وجود کو ہم غنیمت سمجھتے ہیں اور سوائے آپ کے کوئی مردِ میدان اس میدان میں نظر نہیں آتا۔ حق تعالیٰ بہ طفیل اپنے نبیؐ اور ان کے اہل بیتؓ کے آپ کا ناصر و مددگار ہو۔ حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ ''تم میں سے کوئی کامل نہیں ہو سکتا جب تک اس کو دیوانہ نہ کہا جائے۔'' اس وقت وہ دیوانگی جس کی بنیاد اسلامی غیرت و حمیت پر ہوتی ہے، آپ ہی کی فطرت میں نظر آتی ہے۔ والحمد للہ علی ذالک۔ آج وہ وقت ہے کہ تھوڑے عمل کو بڑے ثواب کے بدلے میں بڑی مہربانی سے اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ یہ جہاد قولی جو تمھیں میسّر ہے، جہاد اکبر ہے۔ اس کو غنیمت جانو اور مزید کی طلب رکھو۔ جہاد باللسان جہاد بالسیف سے افضل ہے۔ ہم جیسے بے دست و پا فقرا جن کی دربار شاہی تک رسائی نہیں اس نعمت سے محروم ہیں۔ ہم نے تم کو خزانے کا

پتا دے دیا ہے۔ اگر ہمارا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکا ہے تو شاید تم اس کو پالو۔''

(تذکرۂ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ مرتبہ محمد منظور نعمانی ص: ۱۴۴)

یہ اور اس قسم کے بہت سے خطوط مجدد الف ثانیؒ نے عمائدین سلطنت کو لکھے اور ان کو بتایا کہ نفس پرستی، کفر اور باطل کی راہیں انسان کو خسران اور نامرادی کی طرف لے جاتی ہیں برخلاف اس کے توحید، ایمان اور صداقت میں بنی آدم کے لیے لازوال مسرتوں کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ اللہ کے دین سے منہ پھیرنے والے یا تو بے مغز ہوتے ہیں یا پھر ابلیس کے گرگے جو خود تو کبڑے ہیں، دوسروں کو بھی کبڑا دیکھنا چاہتے ہیں۔ نورِ حق کی تیز شعاعوں سے ان کی آنکھوں میں چکا چوندھ ہو جاتی ہے۔ ان کو اپنی بڑائی کا احساس خدا کے سامنے سر جھکانے سے روکتا ہے، اپنی عقل و بصیرت کے زعم میں وہ صدائے حق کو سنی ان سنی کر دیتے ہیں اور جذباتِ نفس سے مغلوب ہو کر الٹا داعیِ حق کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں کیوں کہ ایمان و یقین کی روشنی پھیلنا ابلیس کی ذرّیت کو کبھی گوارا نہیں۔

چناں چہ اعیانِ سلطنت تک حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شکایات پہنچائی گئیں۔ ان کو مغرور، خود پسند اور خود رائے بتایا گیا۔ ہزار طرح کے عیب نکالے گئے اور کہا گیا کہ یہ ایک زبردست فتنہ ہے۔ سلطنت کی فلاح اس میں ہے کہ اس کا فوراً سد باب کیا جائے۔ یہ خبریں جہانگیر تک پہنچیں تو وہ بھی چوکنا ہوا اور آپ کی شخصیت کو اپنے لیے، اپنی سلطنت کے لیے، اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کیا اور آخر کار وہ شہنشاہ ہندستان جس کے دروازے پر زنجیر عدل آویزاں تھی۔ وہ جو ہر وقت مظلوموں کی دادرسی کے لیے تیار رہتا تھا جہاں ستائے ہوئے لوگوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ حضرت مجددؒ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دینی فریضہ کو برداشت نہ کر سکا اور شیخ کو نادر شاہی حکم کے ساتھ دربار میں طلب کر لیا۔

مغل بادشاہوں کا دربار کسی طرح بھی قیصر و کسریٰ کے درباروں سے کم نہ تھا۔ اول تو قصرِ شاہی کے فلک بوس در و دیوار کا لامتناہی سلسلہ تھا، جو ہر اجنبی پر اپنی ہیبت پر ہیبت ڈالنے کے لیے دور تک چلا گیا تھا۔ پھر فوجی ساز و سامان کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لیے موجود تھی۔ ان کے علاوہ سپاہیوں کے زرق برق لباس آسمان کی طرف بلند ہوئے ان کی پگڑیوں کے

طرّے اور سر سے پیر تک آہن و فولاد میں غرق انسانی مجسمے شان و شوکت کا ایسا منظر تھا کہ معمولی انسان پر تو انھیں دیکھتے ہی رعب طاری ہو جاتا تھا۔

لیکن ایک وہ شخص جو اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان رکھتا تھا اور جو سنت رسول کو زندہ کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا اور جو دل سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ شرک و بدعت کے اس چلتے ہوئے کاروبار کو بند کر کے دعوت حق سے لوگوں کو روشناس کر دیا جائے۔ حکومت وقت کی غلط روش کی جگہ نظامِ حق قائم کیا جائے، بھلا وہ اس کاروباری خسروی سے کیا خوف کھاتا۔ جس کی روح پر ایمان باللہ کا پرتو سایہ فگن تھا۔ اس کو قصر شاہی کا جلال و جبروت کیا ڈرا سکتا تھا۔ جس کے دل کی گہرائیوں میں شاہد ازل کے عشق کا سرور لہریں مار رہا تھا۔ وہ ایوان حکومت کے نمایشی ساز و سامان کو کیا خاطر میں لاتا؟ حاسدین تو دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب شیخ کا سر دربار جہانگیری میں جھکے گا لیکن شیخ اچھی سمجھتے تھے کہ خدا کے دین کی دعوت دینا ہمارا فرض ہے۔ ہم خدا کے بندے ہیں، خدا لازوال طاقت کا مالک ہے، جو اپنی زندگی اس لازوال طاقت کے سپرد کر دیتا ہے اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی شکست نہیں دے سکتی۔

چناں چہ شیخ کو اس دارو گیر کے ہنگامے کی ذرّہ برابر پروا نہ تھی۔ وہ بے خوفی کے ساتھ دربار میں تشریف لائے اور اسلامی طریقے پر سلام کیا۔ نہ درباری آداب کے مطابق جھکے، نہ سجدۂ تعظیمی کیا، اور نہ اور کوئی غیر اسلامی طریقہ اختیار کیا، بلکہ دربار میں پہنچنے کے بعد نہایت بے باکی کے ساتھ بھرے دربار میں مروجہ بدعات کے خلاف پُر زور تقریر کی۔

شاہی دربار میں ایک بے بضاعت شخص کی یہ ہمت! شہنشاہیت نے خشم ناک ہو کر اس فقیرِ بے نوا کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ ایک سخت چٹان بنا کھڑا تھا، جس کی آنکھوں سے نور ایمان کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور چہرے پر فرض شناسی کا جلال چمک رہا تھا۔ اس کی اس جرأت مومنانہ پر دربار ششدر اور ماحول دم بخود تھا۔ برسوں سے سجدۂ تعظیمی کے سوا ''سلام'' کا لفظ بھی کسی نے نہ سنا تھا۔ مدت سے تملق و چاپلوسی کے علاوہ یہ بے باکی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ بادشاہ کو ظل اللہ کہا جاتا تھا۔ اس کے سامنے لب کھولنا سرکشی سے کم نہ تھا۔ ایسی حیات بخش اور جرأت مندانہ باتیں سننے کے لیے دربار میں کوئی تیار نہ تھا۔

تخت شاہی کو بھی یہ صدائے حق راس نہ آئی۔ شخصی آمریت کا جنون بے قابو ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں غصّے کی سرخ آندھیاں چلنے لگیں۔ اس نے اپنی پوری قوت سے فیصلہ صادر کیا کہ اس بے باک شخص کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔

یہ سخت حکم سن کر مخالفین حق کے گھروں میں شادیانے بجنے لگے۔ لیکن شیخ مجدد علیہؒ کے نورانی چہرے پر ابھی متانت کا نور پھیلا ہوا تھا۔ ان کے دل پر شاہی عتاب کا حکم سن کر ذرا بھی اضمحلال طاری نہ ہوا، زبان پر رحم کا لفظ نہ آیا اور حق کی خودداری نے پناہ کی درخواست کو گوارا نہ کیا کیوں کہ محبت میں تلوار کی دھار پر چلنا ہی عین سعادت ہے۔ داعی حق کا دین کی حمایت میں قید و بند کی زندگی گزارنا ہی شرط اولین ہے۔

در مدرسہ کس نہ رسد دعویٰ توحید
منزل گہ مردانِ موحد سر ور است

طوق و سلاسل، ابتلا وآلام اور ظلم و تشدّد کے مقامات حضرت مجددؒ کے سامنے بھی آئے، ان کے مقدس ہاتھوں میں آہنی زنجیریں بھی ڈالی گئیں۔ لیکن دوسری طرف جذبہ عشق اپنا کام کرتا رہا۔ اگر چہ مجاہد راہ حق جیل کی چہار دیواری میں قید تھا۔ مگر مرد حق کے مقدس قدم جہاں بھی پہنچتے ہیں وہیں نور کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ چناں چہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ شیخ مجددؒ نے جیل میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہاں کی فضا روشن ہو گئی اور وہ مقام جو گندہ دل، گندہ ذہن، گندے کردار کے لوگوں کا مسکن تھا اب انوار و تجلیات سے معمور ہو گیا۔ ہندو، مسلمان، چور اور قاتل غرضے کہ سب کے سب شیخ مجددؒ کی پاکیزہ زندگی دیکھ کر ان کے گرویدہ ہو گئے۔ باقاعدہ نمازیں ہونے لگیں اوراد و وظائف کا سلسلہ جاری ہوا یہاں تک کہ تہجد گزاری تک بات پہنچی، جو اس بات کی زندہ شہادت تھی کہ نیکی، ایمان اور حق کے لیے جدو جہد بے کار نہیں جاتی۔ خدا پر یقین رکھنے کا لازمی نتیجہ سر بلندی ہے اقامتِ دین کا جذبہ بار آور ہو کر رہتا ہے اور دنیا میں چاہے ہزار کفر کی تاریکیاں پھیلی ہوئی ہوں اور اس کے فرزند خواہ نور حق کو مٹانے کی کتنی بھی کوشش کریں لیکن سچائی اور صداقت کا آفتاب طلوع ہو کر ہی رہتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں دکھائی جاسکتی کہ، پھونکوں سے چراغ حق کو کسی نے بجھا دیا ہو

چناں چہ یہاں بھی ایک طرف ظلم وجور اور سیاسی ہتھ کنڈوں کا عمل جاری تھا۔ دوسری طرف اللہ کا قانون انسانوں کی قہرمانی پر ہنس رہا تھا۔ اقتدارِ وقت نے اپنی چال چلی اور شیخ مجددؒ کو محبوس کردیا لیکن، اللہ نے شیخ مجددؒ کے دعوتی کام میں برکت عطا کی۔ ان کے ہاتھوں کی آہنی زنجیروں کی مسلسل نغمہ سنجی نے شاہی طاقت کے غرور کو پاش پاش کردیا۔ سچائی کا جو سرچشمہ مردمومن کے دل کی گہرائیوں سے ابل رہا تھا، ظلم وستم کی دیواریں اس نے سامنے کھڑی نہ رہ سکیں اور آخر شیخؒ کے فقیرانہ جاہ وجلال کو دیکھ کر جہانگیر کا غیظ وغضب ٹھنڈا پڑ گیا۔ قید خانے کے قیدیوں کی اخلاقی تربیت نے شاہی استبداد کی آنکھیں کھول دیں اور جہانگیر مجبور ہوگیا کہ ایسے مقدس وجود کو رہا کردے اور عزت واحترام سے پیش آئے۔

یہ بہت بڑی کام یابی تھی کہ بادشاہ وقت آپ کی صدائے حق اور مساعی جمیلہ سے متاثر ہوا اور آگے چل کر شیخؒ کی خصوصی مجلسوں میں بیٹھ کر ان کے افکار وتعلیمات سے فیض یاب ہونے لگا۔

سعی وجہد کا نتیجہ

نتیجۃً برسوں سے جو خلاف شریعت عقائد دلوں پر چھائے ہوئے تھے رفتہ رفتہ دور ہونے لگے۔ جنت، دوزخ، وحی، ختم نبوت اور آخرت کے بارے میں جو شکوک وشبہات راہ پاگئے تھے ان کا صحیح مقام متعین ہوا اور یہ بھی حضرت مجددؒ کی اصلاحی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ:

- شاہی دربار میں سجدۂ تعظیمی موقوف ہوا۔
- خلاف شرع قوانین منسوخ کیے گئے۔
- گائے کے ذبیحہ پر سے پابندی ختم ہوگئی۔
- اور حکومت کا میلان بے دینی سے ہٹ کر دین کی طرف ہوگیا۔

یہ معمولی کام نہیں تھے۔ اگر اس وقت اللہ تعالیٰ مجدد ثانیؒ کے ذریعہ فتنۂ الحاد کو فرو کرنے کا کام نہ لیتا تو عجب نہیں تھا کہ اسلام اس ملک سے اس طرح مٹ جاتا، جس طرح کہ اسپین کی کہانی ہم سنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں اسلام کے قیام واستحکام کی سعی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

لیکن یہاں بھی وہ کمی باقی رہ گئی، جو خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے یہاں دکھائی دیتی ہے یعنی یہ کہ شیخ مجددؒ بھی ایک مسلم معاشرے کی تعمیر پر باقاعدہ توجہ دے سکے اور نہ کوئی مستقل ادارہ تربیت کے لیے قائم کیا، جس میں اہل علم وعمل آتے اور تربیت حاصل کر کے ملک کے دور دراز گوشوں میں جا کر انھی خطوط پر افراد تیار کرتے جو اسلامی نظام کے لیے میدان ہموار کر سکتا۔ انفرادی کوششوں کا جو اثر ہو سکتا تھا وہ آپ کی حیات تک رہا ورنہ تو نسلی امتیازات، نو ایجاد رسموں کی شریعت اور دنیا پرستی کا جذبہ جوں کا توں چلتا رہا، جس کے مٹانے کی خاص طور سے ضرورت تھی۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(۱۷۰۳-۱۷۶۳)

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو بندگی رب کی دعوت دیتا ہے اور ایسے اخلاقی اصولوں کی طرف رہ نمائی کرتا ہے، جو پوری دنیا کے لیے مفید اور کارگر ہیں۔ ان اصولوں کو لانے والے اللہ کے نبی اور اس کے پیغمبر تھے، جو دنیا کے ہر خطے، ہر ملک اور ہر زمانے میں آئے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آپؐ نے دنیا کے انسانوں کو صاف اور واضح الفاظ میں بتایا کہ اس دنیا کا خالق اور مالک اللہ رب العزت ہے اور وہ اکیلا ہے۔ اسی نے ہمیں تمھیں اور ساری دنیا کو پیدا کیا ہے۔ وہی ہمیں کھلاتا پلاتا اور ہماری ضرورتیں پوری کرتا ہے، اس لیے ہمیں اس کی تابع داری کرنی چاہیے اور اسی کی ہدایت پر چلنا چاہیے اور اسی میں ہماری فلاح ہے۔

اسلام کی تعلیمات

عقائد کے ساتھ ساتھ اسلام نے فکر و عمل کو درست کرنے کے اصول بھی بتائے۔ فرد کی اصلاح اور سماج کی صحیح رخ پر تعمیر پر زور دیا، تزکیۂ نفس اور اچھے اخلاق کی ترغیب دی، راست بازی اور انسانی ہم دردی کو کمال انسانیت ٹھہرایا۔ اس کے ساتھ ساتھ ظلم، زیادتی، بخل، کنجوسی، دروغ گوئی اور بدعہدی کو بدترین اخلاقی عیب قرار دیا۔ ساتھ ہی یہ واضح کیا کہ اسلام کی نظر میں شاہ و گدا سب برابر ہیں۔

اشاعت اسلام

اسلام کے بتائے ہوئے بندگیِ رب، وحدت آدم اور نیکی و پاکیزگی کے اصولوں کی یہ دعوت عرب سے نکل کر مشرق و مغرب کے دور دراز گوشوں تک پھیلتی چلی گئی۔ جس کے سامنے نسل و رنگ اور وطن کے محدود تصورات ریت کی دیوار کی طرح زمین دوز ہو گئے اور ادھر سے ادھر تک عدل و انصاف اور بھائی چارہ کی فضا قایم ہوگئی اور قیصر و کسریٰ تک کی سلطنتیں اس کے پیروؤں کے سامنے لرزنے لگیں۔

ترقی وتنزل کا قانون

دنیا کی ہر سوسائٹی کے کچھ آداب ہیں۔ انھی کی تکمیل کے ساتھ اس معاشرے کا وجود قایم رہتا ہے لیکن اگر ان آداب سے صرف نظر کر لیا جائے تو معاشرہ تنزل اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے، اس کی ہوا اکھڑ جاتی ہے اور اس کے وجود پر انگلی اٹھنے لگتی ہے۔ دنیا کی قوموں کی تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسلامی سوسائٹی کے بھی کچھ آداب و شرائط ہیں، جس میں خدا کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نیز انما المومنون اخوۃ اور بعضھم اولیاء بعض کی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جب تک لوگ اس رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہے وہ ترقی کے مدارج طے کرتے رہے۔ ان میں خالد بن ولیدؓ، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم اور صلاح الدین جیسے بہادر پیدا ہوتے رہے، جنھوں نے اسلام کا پرچم دنیا کی آخری سرحدوں تک لہرا دیا لیکن مسلمانوں نے اس نصب العین سے جیسے ہی سر موانحراف کیا اور اللہ و رسول کی نافرمانی کی راہ اپنائی اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشی ہوئی تمام نعمتیں، تخت و تاج، شان و شوکت، رعب و دبدبہ سب کچھ چھین لیا اور ہمارے برے اعمال کے نتیجے میں ظالم حکمراں ہم پر مسلط کر دیے۔ اس وقت مسلمان اسی دور سے گزر رہے ہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد باقاعدہ طور پر محمد بن قاسم کے حملے کے بعد سے شروع ہوئی تھی۔ محمد بن قاسم ایک باصلاحیت سپہ سالار تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں اسلامی اصولوں

کے تحت عدل و انصاف کا اتنا اچھا نظام قائم کیا کہ مقامی باشندے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ مگر اچانک اس کی واپسی کے بعد نظام اسلامی کا یہ سلسلہ جو خلافت سے جڑا ہوا تھا منقطع ہو گیا اور پھر کئی سو برس کی خاموشی کے بعد شمال مغرب درہ خیبر کی جانب سے دوبارہ مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی، جس کا مقصد ملک گیری تھا اور جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ دولت وعشرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور تن آسانی و خدا فراموشی اس کے لوازمات ہیں۔ سات سو سال کے لمبے عرصے میں مسلمان دھیرے دھیرے اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔ ان میں تن آسانی اور عیش پسندی کی رغبت پیدا ہوئی۔ جنگ جو افراد کا وقت زیادہ تر سیر وتفریح میں گزرنے لگا۔ اسلام نے جو ایک عظیم نصیب العین ان کے سامنے رکھا تھا اسے انھوں نے پس پشت ڈال دیا حتیٰ کہ اپنا اسلامی تشخص بھی وہ بھول گئے۔

دوسری طرف اکبر نے سیاسی تقاضوں کے پیش نظر ایک نئے مذہب کی بنیاد ''دین الٰہی'' کے نام سے رکھی، جس سے شیطان کو مسلم سوسائٹی میں درآنے کا اور بھی موقع ہاتھ آ گیا۔ بس پھر کیا تھا، گم راہیاں بڑھیں، پادشاہوں کی خداوندی کا سکہ رواں ہو گیا اور عوام قرآن وسنت کی روشنی سے محروم ہوتے چلے گئے۔ امراء اور فقہا عیش پرستی اور دنیا طلبی کے جال میں بری طرح پھنس گئے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کا سیاسی زوال بھی شروع ہو گیا۔

سیاسی زوال

دوسرا المیہ یہ ہوا کہ مغل فرماں روا اورنگ زیب عالم گیرؒ کے انتقال کے بعد کوئی ایسا اولوالعزم اور دور اندیش شخص دلّی کے تخت پر نہ بیٹھا، جو اتنی عظیم سلطنت کو سنبھال لیتا بلکہ اور الٹا امارت و وزارت کی کش مکش نے دربار کو دنگل بنا دیا۔ اس رسہ کشی کا اثر عسکری نظام پر پڑنا لازمی تھا۔ چناں چہ حالت یہ تھی کہ اکثر سپہ سالار پالکیوں میں بیٹھ کر میدان کارزار میں جاتے تھے اور اسی کو مردانگی گردانتے تھے۔

اس کے علاوہ شاہی دربار میں قوّالوں، بھانڈوں اور مسخروں کا ہجوم رہتا تھا۔ اکل و شرب، سیر وشکار اور لہو ولعب کے سوا زندگی کا کوئی نصب العین نہیں تھا، روز وشب می خواری اور بادہ نوشی کے ساتھ رقص وسرود کی محفلیں جمتیں، بادشاہ کے ہم راہ عام درباری تک داد عیش دیتے

تھے۔ بازاری میلوں ٹھیلوں میں بادشاہ بہ نفس نفیس رنگین مزاجی سے شریک ہوتا تھا اور پوری آبادی اس کے ساتھ جشن مناتی تھی۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ پورا ملک اندرونی و بیرونی سازشوں کے ہاتھوں خلفشار کا شکار تھا۔ مرکز کو کمزور دیکھ کر دکن کے مرہٹے، پنجاب کے سکھ اور یو۔ پی کے جاٹوں نے اسلامی سلطنت کو خوان یغما سمجھ کر لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار ہر چہار طرف گرم کر دیا تھا۔

اخلاقی پستی

سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی خرابیاں بھی ادھر سے ادھر تک پھیلتی چلی گئیں۔ قوم کا ایک بڑا مفید اور کارآمد گروہ صرف بادشاہوں کے اغراض نفسانی پورا کرنے کا آلہ بن گیا تھا اور ان پڑھ طبقہ جو کورانہ تقلید کا عادی سقاوہ شکم پری اور تن پروری کے سوا کچھ نہ جانتا تھا۔ اس طرح ساری اسلامی ملت مردہ لاش کی طرح بے جان تھی اور کہیں بھی زندگی کی کوئی علامت دکھائی نہ دیتی تھی۔

معاشرتی زندگی پست سے پست تر تھی، شادی بیاہ کے موقعوں پر غیر ضروری اخراجات بڑھا لیے تھے۔ ولیمہ اور عقیقہ جیسی جائز تقریبات کو بھی شہرت و ناموری کے خیال سے ادا کیا جاتا تھا، عقد بیوگان کو ہندوؤں کی دیکھا دیکھی معیوب سمجھا جانے لگا تھا اور زیادہ مہر باندھنا شان امارت میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سدیم، چہلم اور برسی کی رسوم بھی بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھیں۔ جو آدمی بھی خوش حال ہو جاتا تھا وہ اپنے لباس اور کھانے پینے پر اتنا خرچ کرتا تھا کہ اس نمائش سے اس کی آمدنی کم پڑ جاتی تھی۔

دینی انحطاط

معاشرتی بگاڑ اور سیاسی زوال کا بڑا سبب دینی انحطاط تھا۔ دنیا طلبی اور آخرت فراموشی کی دل دل میں چوں کہ اوپر سے نیچے تک لوگ پھنسے ہوئے تھے اس لیے جاہلی افکار کو آمیزش کا خوب موقع ملا۔ دین کے عقائد و اخلاق کی جگہ ہر طرح کی رسمیں مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں

عرس، قبر پرستی، چڑھاوے اور میلاد خوانی کو دین حق کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ شرک و بدعت کا ہر طبقے میں اتنا دخل ہوگیا تھا کہ توحید کا تصور مسخ ہوکر رہ گیا تھا۔ توہم پرستی، جن بھوت، تعویز گنڈے پر عام اعتقاد تھا، تقلیدی اثرات اور علمائے سو کی شخصیت کا اتنا اثر غالب تھا کہ پوری سوسائٹی میں کوئی ایک شخص بھی حق و صداقت کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ لوگوں کی حالت بے عقل جانوروں کی سی ہوگئی تھی جن کے گلّے بے سمجھے بوجھے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اللہ کی آیات کے ساتھ علماء سو کا منافقانہ طرز عمل چار سو پھیلا ہوا تھا۔ خدا پرستی کی جگہ خود پرستی، ریاکاری اور گندم نما جوفروشی کا شیوہ عام طور پر رائج تھا اور اسی کو اصل دین کی حیثیت سے وہ عوام میں پیر جی بن کر پیش کرتے تھے اور شیطانی کرشموں کے ساتھ لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ یہ سب امور کی تعلیم خدا کی طرف سے دی گئی ہے۔

تصوف کے اثرات

ہندوؤں کی دن رات کی صحبت سے تصوف نے رہبانیت کا رنگ اختیار کرلیا تھا اور مسلمانوں میں ’’ہمہ اوست‘‘ کا عقیدہ چل پڑا تھا، ہندو جوگیوں اور عیسائی راہبوں کی طرح ایذائے جسمانی اور گرہستی بھی زندگی سے دوری میں اپنے آپ کو مبتلائے عذاب کرنا تصوف کے لوازم بن چکے تھے، دھونی زمانا، چلّے کھینچنا، آبادیوں کو چھوڑ کر خانقاہوں اور جنگلوں میں رہنا دین کا جز سمجھا جانے لگا تھا اور اگر کسی شہری آبادی میں کوئی خانقاہ تھی بھی تو خشک زندگی کے ردِّعمل کے طور پر وہاں سماع و رقص کا اول مقام تھا۔

غرض ایک طرف اگر صوفیوں نے خانقاہوں میں گوشہ گیری اختیار کی تھی تو دوسری طرف مجاہدین اسلام اور علمائے کرام بادشاہوں کی شہ نشینی کو زندگی کی معراج سمجھ بیٹھے تھے اور ان کی ایک بڑی اکثریت دوراز کار بحثوں اور سطحی مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ عوام و خواص ایسی باتوں پر عامل تھے جو سراسر دین کے منافی تھیں جن کا نتیجہ عمل و حرکت کے فقدان کی صورت میں ظاہر ہورہا تھا۔

یہ وہ نازک حالات تھے جب اللہ رب العزت نے مسلمان قوم کو اپنی رحمت سے نوازا اور اورنگ زیبؒ کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی (قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر) میں

شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان شروع ہی سے علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا۔ آپ کے والد مدرسہ رحیمیہ میں قرآن وحدیث کا درس دیا کرتے تھے شاہ صاحب نے اکثر علوم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیے تھے اور اس ماحول کے عام رواج کے مطابق پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ ۲۹ رسال کی عمر میں جب حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تو وہاں شیخ ابوطاہر المدینی سے فیض علم حاصل کیا۔

شاہ صاحبؒ کو اللہ کی طرف سے مجتہدانہ بصیرت عطا ہوئی تھی۔ ان کے پاس ایک عظیم مفکر کا ذہن تھا۔ وہ پیدائشی طور پر مبلغ و مصلح تھے۔ خوش قسمتی سے والدین نے دین کی صحیح تربیت کی اور پورے طور پر ان کا قلب وذہن کتاب وسنت کے نور سے منور ہوتا چلا گیا۔

شاہ صاحبؒ اور کارِ تجدید

شاہ صاحبؒ کے دور میں ایک طرف نام کی اسلامی حکومت ہندستانی حدوں کو چھور ہی تھی اور دوسری طرف سیاسی زوال کا یہ عالم تھا کہ مرکزی طاقت صرف لال قلعہ دہلی تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں مرہٹے اور سکھ عسکری قوت پیدا کر کے دہلی کے آس پاس چھاپے مارنے لگے تھے اور بادشاہ بیچارہ

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم

کی تصویر بنا ہوا حالات سے مجبور غم غلط کرنے کے لیے رنگ رلیوں میں مصروف رہتا تھا۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ نے اس وقت کی حکومت کو مجوسیوں کی حکومت سے تعبیر کیا ہے۔ چناں چہ اپنی مشہور تالیف ''إزالة الخفاء عن تاريخ الخلفاء'' جلد اول میں فرماتے ہیں:

> ''ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اس تغیر کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں، معلوم نہیں آگے چل کر خدا تعالیٰ کیا دکھانا چاہتا ہے۔'' (ص:۱۵۷)

اس کے علاوہ آپ نے مسلم سوسائٹی پر نظر ڈالی تو اللہ نے آپ پر اس زمانے کے تمام

خرافات منکشف کردیے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان بری طرح ہندو تہذیب سے متاثر ہیں۔ شرک و بدعت نے مسلم گھرانوں میں اتنا اثر جمالیا ہے کہ مسلم و غیر مسلم میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ وہ نمایشی کاموں میں پھنس کر توحید و سنت سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ حالت یہ تھی کہ مختلف ہندو تہواروں میں شریک ہوتے تھے حتیٰ کہ ان کے دیوی دیوتاؤں سے منّتیں ماننے کو برا نہیں سمجھتے تھے۔

دین، انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور وہ اس طرح لٹ رہا تھا مگر افسوس یہ تھا کہ اس کی فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا، عوام تو خیر سادہ لوح ہی ہوتے ہیں لیکن وہ لوگ بھی جن کے ذمّے اعلائے کلمۃ الحق کا کام تھا جن کو برائیوں کو روکنے اور حق کو قائم کرنے کا فرض انجام دینا تھا اس راہ سے منہ موڑ کر نظام باطل کے کل پرزے بنتے جا رہے تھے۔ جناب عبد الوحید صاحب نے اپنی کتاب ''افکار و سیاسیات'' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''ملوکیت کی تاریخ کا ہر باب اس امر کا شاہد ہے کہ علما کی اکثریت نے غلط نظام حکومت کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی جدو جہد کرنے کے بہ جائے خود مذہب اسلام کو اس نظام کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ ملوک و سلاطین اور جمہور کی آسانی کے لیے لطائف الحیل و تاویلات کے بے شمار دروازے اسلام میں کھول دیے۔ ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ نظام ملوکیت کو ختم کر کے خلافت و بادشاہت کا اسلامی نظام قائم کرنے میں کوشش کرتے یا رائے عامہ کے خلاف کھڑے ہوتے۔ اس لیے خود اس رنگ میں رنگ گئے، جو جمہور کو مرغوب تھا یا جو بادشاہِ وقت کی رضامندی کو مطلوب تھا، اس لیے ابلیس کا بصد فخر یہ دعویٰ کرنا بالکل صحیح ہے ؎ یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں''
>
> (افکار و سیاسات ص:۵۰۶)

غرض، اس دور میں نیکیوں کا حکم دینے اور برائیوں کو روکنے کے بہ جائے علمائے کرام کا نصب العین رائج الوقت نظام و رسوم کا ساتھ دینا ہو گیا تھا۔ دنیوی اعزاز و مرتبہ حاصل کرنے کی آرزو میں یہ بادشاہوں کی ہر اچھی بری بات پر ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

کارتجدید کی ابتدا

ان حالات میں شاہ ولی اللہؒ نے خدمت اسلام کا بیڑا اٹھایا، جو بڑی ہمت کا کام تھا جب کہ لوگ عہدوں اور درجات کی بلندی اور مال و دولت کی فراوانی کو بڑی چیز سمجھ رہے تھے اور آخرت کو بھول گئے تھے۔ عوام خدا کے قانون سے اس لیے آزاد تھے کہ وہ خدا کی دی ہوئی روشنی سے محروم تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اس روشنی کی نشان دہی کی اور لوگوں کی نبض پر ہاتھ رکھا، سلاطین و امراء کی ذاتی و انفرادی خرابیوں پر تنقید کر کے بتایا کہ تمھاری حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند ہے۔ آپ نے موروثی بادشاہت اور نظام ملوکیت کی پورے طور پر مخالفت کی۔ تفہیمات الٰہیہ کے صفحہ ۹۲-۹۳ میں ایک جگہ امراء کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں امراء سے کہتا ہوں کہ تمھیں خدا کا خوف نہیں آتا؟ تم فانی لذّتوں کی طلب میں مستغرق ہوگئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جارہی ہیں اور تم نہیں روکتے، زنا کاری اور قمار بازی کے اڈّے سرعام بن گئے اور تم انسداد نہیں کرتے! اس عظیم الشان ملک میں مدت ہائے دراز سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی۔ جس کو تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو، کھانوں کی لذّت عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں جن میں تم ڈوب گئے ہو، کبھی خدا کا خیال تمھیں نہیں آتا۔'' (بہ حوالہ تجدید احیائے دین از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ص: ۹۴-۹۵)

بادشاہوں کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے ان کی فوجوں کے ذمے دار افسروں سے جن پر پوری سلطنت کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے، للکار کر کہا:

> ''میں ان فوجی آدمیوں سے کہتا ہوں کہ تم کو اللہ نے جہاد کے لیے، اعلائے کلمہ حق کے لیے اور شرک و اہل شرک کا زور توڑنے کے لیے فوجی بنایا تھا،

اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنا لیا۔ اب جہاد کی نیت اور مقصد سے تمھارے دل خالی ہیں پیسہ کمانے کے لیے سپاہی گیری کا پیشہ کرتے ہو، بھنگ اور شراب پیتے ہو، داڑھیاں منڈاتے اور مونچھیں بڑھاتے ہو، بندگان خدا پر ظلم ڈھاتے ہو اور تمھیں کبھی بھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ حرام کی روٹی کمار ہے ہو یا حلال کی۔ خدا کی قسم، ایک دن تمھیں دنیا سے جانا ہے، پھر اللہ تمھیں بتائے گا کہ کیا کر کے آئے ہو۔''

(تجدید احیائے دین، ص:۹۵)

عام مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تنزلی کی نشان دہی کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

''پھر میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو عام خطاب کر کے کہتا ہوں کہ بنی آدم! تم نے اپنے اخلاق کھو دیے، تم پر تنگی چھا گئی اور شیطان تمھارا محافظ بن گیا۔ عورتیں مردوں پر حاوی ہو گئیں ہیں اور مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔ حرام میں تمھیں مزا آتا ہے اور حلال تمھارے لیے بدمزہ بن گیا ہے۔

آگے چل کر بتایا ہے:

تم نے عاشورہ اور شب برات کے دنوں کو کھیل تماشوں کے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ پھر طلاق کو ممنوع اور بیوہ کو بٹھائے رکھنے کی رسم نکال لی ہے گویا تم پر کسی نے فرض کر دیا ہے کہ جب کوئی مرے تو اس کے اقرباء کو خوب کھانے کھلاؤ، تم نمازوں سے غافل ہو، کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ نماز کے لیے وقت نہیں پاتا اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔ تم زکوٰۃ سے غافل ہو، تم میں سے کوئی مال دار ایسا نہیں ہے، جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں وہ انھیں کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہے مگر زکوٰۃ اور

عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔'' (تجدید احیائے دین ص: ۹۴-۹۵)

صحیح فکر نہ ہونے سے آدمی حق و باطل کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ کر دنیا کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان کی موافقت اور مخالفت دنیا کے رجحان کی بنیاد پر ہوتی ہے، وہ عقل وفہم رکھتے ہوئے صحیح و غلط میں تمیز نہیں کر سکتے، شاہ صاحبؒ کے عہد میں مسلمانوں کی یہی کیفیت تھی اسی وجہ سے ان کے اخلاق تباہ ہو گئے۔ ان کی معاشرت بگڑتی چلی گئی۔ ان کے مذہبی امور میں خلل واقع ہوتا گیا، جس میں فقہا تک شامل تھے۔ چناں چہ تفہیمات کے دوسرے حصے میں ایک جگہ صحیح فکر کے فقدان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ لوگ دیکھے ہیں، جنھوں نے صلحا کو اربـاباً من دون اللّٰہ اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی ﷺ کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گنہ گار میرے لیے۔ یہ ایسی بات ہے جیسی یہودی کہتے ہیں لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلاَّ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔ (ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لیے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں تحریف پھیلی ہوئی ہے۔ صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے خصوصاً مسئلہ توحید، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پروا نہیں۔''

(التفہیمات جلد دوم ص: ۱۳۴-۱۳۵ بحوالہ تجدید احیائے دین ص: ۹۷-۹۸)

دنیا میں زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ وہ ہے، جس کو اللہ کے نبیوں نے اختیار کیا، اس کے علاوہ جتنے بھی افکار و نظریات ہیں وہ سب غلط اور باطل ہیں اور انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ کبھی کبھی آدمی اپنی عقل پر بھروسہ کر کے یا دوسروں کی دیکھا دیکھی کسی راہ پر چل پڑتا ہے تو اس کا رخ صراط مستقیم سے پھر جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے عہد میں کچھ ایسی ہی کیفیت تھی

مسلم معاشرے کے بیشتر افراد گم راہی کے شکار تھے۔ شاہ صاحب نے انھیں احساس دلایا کہ وہ اپنے بگڑے ہوئے عقائد کو چھوڑ کر خدا کے دین کو اختیار کریں اور اس کے رسولؐ کے مطیع و تابع بن جائیں۔ اپنے اندر صحیح فکر پیدا کریں، جس سے حق و باطل میں تمیز ہو سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جو دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی رکھتے تھے انھیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ اگر حکومت کے یہی لیل و نہار رہے تو ایک دن یہ نام کی سلطنت بھی تاراج ہو جائے گی اسی لیے آپ نے احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کو خطوط لکھ لکھ کر اکسایا کہ وہ کمر کس کر دشمن کے مقابلے پر کھڑے ہوں تا کہ ہر وقت کی لوٹ مار اور غارت گری کا سدّ باب ہو سکے۔ احمد شاہ ابدالی کے ایک خط میں شاہ صاحب نے مرہٹوں کی کم زوریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''مرہٹوں کے شکست دینا آسان کام ہے بہ شرطے کہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرہٹہ قوم خود قلیل ہیں مگر ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس گروہ میں سے ایک صف کو بھی درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی۔ چوں کہ یہ قوم قوی نہیں ہے اس لیے اس کا تمام تر سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ ہو دل آوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔''

اس طرح شاہ صاحبؒ کی ترغیب و دعوت پر احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی تین لاکھ فوج سے پانی پت کے میدان میں لوہا لیا مقابلہ سخت تھا لیکن خدا کی نصرت اور شاہ صاحب کی دعائیں ساتھ تھیں مرہٹوں کی بری طرح شکست ہوئی اور ان کا شمالی ہندستان پر حکومت کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

قرآن مجید کا فارسی ترجمہ

سیاسی بیداری کے علاوہ آپ نے ایک بڑا کام قرآن پاک کے ترجمے کا کیا۔ اس وقت

فارسی کا زیادہ زور تھا اور عربی زبان کی طرف کم توجہ تھی اسی لیے دین سے دوری بڑھتی جارہی تھی۔ قرآن پاک کا مصرف اس وقت صرف اتنا رہ گیا تھا کہ برکت کے خیال سے وہ گھر میں رکھا رہے۔اس سلسلے میں آپ نے فرمایا:

''اللہ کا کلام اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاقوں میں رکھا جائے یا دوسری قومیں جس طرح منتر پڑھتی ہیں ہم بھی طوطے کی طرح اسے بغیر سمجھے بوجھے پڑھا کریں۔ یہ کتاب انسانوں کی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو۔''

(رودِ کوثر۔از محمد اکرم)

باطل کی ہمیشہ سے حق سے دشمنی ہے۔اسے ذرا پتا چل جائے کہ کسی نے حق کو اپنا لیا ہے یا حق کے فروغ کے لیے کوئی راہ نکالی ہے تو وہ اس کی زندگی دوبھر کردیتا ہے۔اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس چراغ کو بجھا دیا جائے ، مردحق کی کوششوں پر پانی پھیر دیا جائے۔ چناں چہ قرآن پاک کا ترجمہ کیا ہوا بس ایک طوفان برپا ہوگیا۔نام نہاد علما نے اس ترجمے کی سخت مخالفت کی۔ اس زمانے میں دہلی میں نجف علی خاں کا تسلّط تھا اس ظالم نے مخالفین کے کہنے پر آپ کے ہاتھوں کے پہنچے اتروا دیے تاکہ آئندہ اور کوئی کتاب نہ لکھ سکیں۔

لیکن جیسے جیسے لوگ قرآن کا ترجمہ پڑھتے گئے اس کی صحیح حکمت سے آگاہ ہوتے گئے اور مخالفت کا جو طوفان اٹھا تھا وہ بھی آخر کم ہوگیا۔اس طرح قرآن مجید کے ترجمے کی راہ ہموار ہوئی اور تھوڑی ہی مدت کے بعد آپ کی نسل کے علمائے کرام نے یہ محسوس کرکے کہ مسلمانوں میں اردو کا رواج تیزی سے بڑھتا جارہا ہے دو ترجمے اردو زبان میں کرڈالے ،جس میں شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بامحاورہ ہے اور شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ لفظی۔تاہم دونوں ترجمے عام فہم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔آج ہم جانتے ہیں کہ شاہ صاحب کے اس اقدام نے قرآن پاک کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے میں کتنا بڑا کام کیا ہے۔

انھی ایّام میں شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان میں ''الفوز الکبیر'' لکھی۔ اس کتاب میں قرآن کے نزول اور تفسیر قرآن کے اصول سے بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر اہل علم جانتے ہیں کہ نہایت جامع ہے۔ انداز بیان بھی عام فہم اور سلیس ہے۔ روحِ قرآن کو سمجھنے کے لیے اس کی حیثیت ایک چابی کی ہے۔

اسلامی نظام حیات کی تدوین

انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے مسائل پیش آتے ہیں۔ ان کو حل کرنا اس کی زندگی کا مقصد ہے لیکن انسانی ذہن کی تمام تدابیر اس معاملے میں ہمیشہ بے کار ثابت ہوئی ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایک مسئلہ سلجھتا ہے تو سو مسئلے اور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نئی نئی تحریکیں اٹھیں مگر تجربات کے میدان میں ناکام ثابت ہوئیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا نظام ہے، جو انسانی زندگی کے تمام مسائل حل کرتا ہے۔ اس کا دستور العمل فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ وہ فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات کا بہترین نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ نسلی تفوق اور خاندان کی برتری کا بھی قائل نہیں ہے۔ وہ انسانوں کی تقسیم کو وطنیت اور قومیت کی بنا پر روا نہیں رکھتا۔ اس کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ وہ انسان کو خدا کا خلیفہ کہتا ہے، جس کا کام خدا کے مقررہ قانون کو دنیا میں جاری کرنا ہے تاکہ لوگوں کو امن و راحت نصیب ہو۔

لیکن آدمی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ وہ بار بار صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے اور شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑتا ہے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں بھی لوگ توہمات کا شکار ہو کر سیدھی سچی راہ کو بھول چکے تھے۔ خود مسلمان جو اس راستے کے داعی تھے بری طرح جاہلیت کی دل دل میں پھنسے ہوئے تھے۔ شاہ صاحب احیائے اسلام کے لیے اٹھے تھے۔ وہ دین حق کو پھر سے دنیا میں سربلند کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اسلامی نظام حیات کی تدوین کی۔ اس سلسلے میں حجۃ اللہ البالغہ اور بدور البازغہ جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں، جنھوں نے اہل علم و فضل کے سامنے نئی شاہراہ کھولی، جو شریعت کی روح اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ اس سے قبل نظام اسلامی کا کوئی تخیل مسلمانوں میں باقی نہ رہا تھا۔ آپ نے اس دور کے موروثی

بادشاہت اور نظامِ ملوکیت پر سخت تنقید کی اور جاہلی حکومت نیز اسلامی حکومت کے فرق کو بالکل نمایاں کر کے دکھایا۔ موروثی حکومتوں سے جو نقصانات مسلمانوں کو پہنچے تھے وہ بھی لوگوں کے سامنے رکھے اور اسلامی خلافت میں جو برکتیں اللہ نے رکھی ہیں وہ بھی کھول کر بیان کیں۔

اس تحریک کا یہ نتیجہ تھا کہ آگے چل کر عملی طور پر اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمعیلؒ نے جدو جہد کا آغاز کیا، جو بالاکوٹ کے مقام پر جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ میں ولی اللہی تحریک ابھری اور اس جماعت کے بہت سے افراد نے کھل کر جہادِ حق میں حصہ لیا جن میں خاص طور سے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اسلامی نظامِ حکومت کی تدوین

شاہ ولی اللہؒ کا اسلامی نظامِ حکومت کی تدوین کا کارنامہ عالمِ اسلام کے ہی لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا صرف قیصر و کسریٰ کے طرزِ حکومت سے واقف تھی، جس میں عوام کو دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی لیکن اسلام نے لوگوں کو آزادیِ رائے کا حق عطا کیا۔ جس کا ثبوت خلافتِ راشدہ کے دور میں پوری طرح دکھائی دیتا ہے کہ ایک معمولی آدمی بھی خلیفۂ وقت کو بھرے دربار میں ٹوک سکتا تھا لیکن اس کے بعد موروثی بادشاہت کا دور دورہ شروع ہو گیا اور لوگ اسلام کے عادلانہ نظامِ حیات کو بھولتے چلے گئے حتیٰ کہ اسلامی نظامِ حکومت اور دوسرے نظامِ سیاست میں فرق کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس خرابی کو شدت سے محسوس کیا اور نظامِ جاہلیت کی نفی کرتے ہوئے انسانی فلاح و بہبود کے لیے خلافتِ راشدہ کے طریقِ حکومت کی نمایندگی کی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاسیات، اقتصادیات و معاشیات کے ہر پہلو کو اجاگر کیا تاکہ آگے چل کر انھی بنیادوں پر اسلامی حکومت کا ڈھانچا کھڑا کیا جا سکے۔ یہ کوئی نیا ڈھانچا نہیں تھا بلکہ یہ وہی سیدھا سچا طریقہ تھا، جس کی نشان دہی آج سے چودہ سو سال پہلے اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ منورہ کے معاشرے میں فرمائی تھی اور جس کو آپؐ کے خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں نافذ کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کا دستورِ حکومت نہایت

متوازن اور مستحکم ہے۔ نیز یہ ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کے لیے فلاح وترقی کا ضامن ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سے ان کی وسعت نظری اور گہرائی فہم وبصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے عقائد، افکار، اخلاق، تمدن اور سیاست وحکومت کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ یہ تمام باتیں اس کتاب میں اس تفصیل سے آگئی ہیں کہ اسلامی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔

ملت میں روح اجتہاد مردہ ہو چکی تھی اور ایک لمبی مدت سے دماغ تقلید جامد کے شکار تھے لیکن شاہ صاحبؒ کی ہمت افزا پیش قدمی نے اس طلسم کو توڑ کر نظام اسلامی کے شاہراہ کی نشان دہی کردی۔

معاشرے کی اصلاح

اسلام میں تقویٰ وطہارت کی خاص اہمیت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں پر بہت زور دیا ہے کیوں کہ آدمی جتنا ان کا پابند ہوگا اتنا ہی جھوٹ، لالچ، بے ایمانی، بدگمانی، بہتان تراشی جیسی برائیوں سے بچے گا، جو اسے مذہب سے دور کردینے والی ہیں۔ ایسا آدمی اپنے ہر کام کو اسلامی ہدایت کے مطابق انجام دے گا، حلال روزی کی تلاش کرے گا۔ ہر شخص سے محبت، ہم دردی اور پیار کا برتاؤ کرے گا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ رب العزت کا یہی حکم ہے۔

اس کے برعکس جس معاشرے سے تقویٰ کی روح نکل جاتی ہے وہاں خود غرضی، دھوکا دہی اور بے ایمانی کے جذبات ابھر کر اوپر آجاتے ہیں، دولت کمانے کی دھن آدمی کو اندھا کردیتی ہے اور اچھا خاصا معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔ جس کا کام سوائے اپنے عیش و عشرت اور پیٹ بھرنے کے کچھ نہیں رہتا حتیٰ کہ یہ احساس بھی ختم ہوجاتا ہے کہ برائی کو برا سمجھ کر افسوس ظاہر کردے۔

یہی صورت حال اس وقت بھی تھی، جب شاہ ولی اللہؒ نے ملت کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ دولت کی بہتات سے ہر قسم کی برائیاں سماج میں موجود تھیں، بے حیائی عام تھی۔ نفسانی خواہشات

کی تکمیل کے لیے ہر طرف شاہدانِ بازاری کا ہجوم رہتا تھا، ناچ رنگ، گانا بجانا اور رقص وسرود زندگی کے لوازمات میں شامل ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب نے ان سب کے خلاف تحریک چلائی، غیر شرعی باتوں کی نشان دہی کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں تا کہ لوگوں کے سامنے شریعت حقہ کی باتیں آسکیں اور وہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں کتاب وسنت کے مطابق عمل کر سکیں۔

شاہ صاحب نے شرک وبدعت کو ترک کرنے پر خاص طور سے زور دیا۔ نجوم، رمل، کہانت، جادو، ٹونے ٹوٹکوں اور اعمال جوگیہ کی سخت مخالفت کی، ایسے نام رکھنے کی بھی مخالفت کی جن سے عقیدۂ توحید کی نفی ہوتی ہو جیسے امام بخش، نبی بخش، مدار بخش وغیرہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی بدعتوں اور رسوم کو جیسے تیجا، دسواں، چہلم، تعزیہ داری وغیرہ کو خلاف شرع ٹھہرایا اور عوام وخواص کو ان کے چھوڑنے کی تلقین کی۔ یہ ان کے اخلاص کی برکت تھی کہ اعلائے کلمۃ الحق کا سلسلہ ان کے بعد بھی چلتا رہا اور آپ کی نسل میں ہی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ محمد اسحاقؒ اور شاہ محمد اسمعیل شہیدؒ نے لوگوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور مسلمانوں کی بے اعتدالیوں کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کی۔

تصوف میں اعتدال کی راہ

شاہ ولی اللہ کے عہد میں تصوف کا بھی خاصا زور تھا۔ ملت کا ایک فعال حصہ اس کی طرف تیزی سے کھنچا جارہا تھا اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو مجاہدات وریاضات کے ذریعے خدا کے دیدار کا دعوے دار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تصوف نبوت کا ہی جز ہے اور اس کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی، جن کو شریعت اور طریقت کہا جاتا ہے۔ شریعت عوام کے لیے ہے اور طریقت خواص کے لیے۔ جس کا تعلق قلب کی صفائی اور روحانی بلندی سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری ارکان کی پابندی نماز، روزہ، عبادات اور اتباع سنت کے معاملات عام لوگوں کے لیے ہیں لیکن ارباب تصوف ان بندشوں سے آزاد ہیں، ان کی نجات کے لیے نفس کشی، ترک دنیا، حبسِ دم اور مراقبے جیسے اعمال کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں فقر وجہاد اسلام کی روح ہیں لیکن یہاں فقر سے مراد وہ طریقہ ہے، جو اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ نے بتایا اور جس پر صحابہ کرامؓ نے چل کر دکھایا۔ چناں چہ اسی لیے شاہ صاحب نے ان تمام ایسے طریقوں کی نفی کی، جو حضور اکرمؐ کی سنت کے خلاف ہیں۔

آپ نے بتایا کہ رسول کریمؐ نے کبھی حبسِ دم اور فاقہ کشی کے ذریعہ قلب کی طاقت میں اضافہ کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی بھی نفس کشی اور ترک دنیا کے اوصاف سے خالی نظر آتی ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بعد کی پیداوار ہے۔ اس سلسلے میں امام احمد بن حنبلؒ سے صوفیاء کے احوال و کیفیاتِ قلب کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

''یہ ایک ایسی چیز ہے، جس پر نہ صحابہؓ نے گفتگو کی نہ تابعین نے۔''

ان کے یہاں پیری مریدی، نفس کشی، حبس دم اور مراقبہ ورہبانیت جیسی چیزوں کا دور دور پتا نہیں ہے۔ دراصل صحابہ کرامؓ تو تعلیمات قرآنی کا صحیح مرقع اور اسوۂ رسول اکرم ﷺ کا سچا نمونہ تھے۔ ان کی زندگی ہوا و ہوس سے پاک اور اصلی فقر و غناء سے آراستہ تھی، حکمِ الٰہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا اور اسلام کی برتری کے لیے جہاد ان کی منزل تھی۔ انھوں نے آج کل کے صوفیوں کی طرح غیر اسلامی طریقوں کی پیروی کبھی نہیں کی۔

شاہ صاحب نے تصوف پر کئی کتابیں لکھیں اور ان میں کھول کر بتایا کہ غیر اسلامی طریقوں کے اپنانے کی وجہ سے ملت میں دین و سیاست کی تفریق ہوئی۔ اور دوسرا نقصان یہ ہوا کہ زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے سے وحدت ملت پارہ پارہ ہوگئی اور اسلام کی عالم گیر برادری مختلف گروہوں میں بٹ کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ اجتماعی مفاد سے صرف نظر کرکے آدمی انفرادی نجات کے لیے مکاشفات اور چلہ کشی کو سب کچھ سمجھ بیٹھا اور گوشہ نشینی کی عادت نے لوگوں کو بدعملی اور زندگی کی جدوجہد سے فرار کا سبق سکھا دیا۔

شاہ صاحب کے کام کا مختصر خاکہ

یہ دنیا انسانوں سے بھری پڑی ہے کہ لیکن ان میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جن کو حق و صداقت پر پوری طرح شرح صدر ہو اور اس کی دعوت دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہوں۔ شاہ صاحبؒ کے عہد میں بھی ایسے لوگ بہت تھے جو حق و باطل میں امتیاز کرنا جانتے تھے۔ لیکن ان میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وقت کے نظام کے خلاف کچھ کہہ سکیں یا غیر صالح سوسائٹی کو اس کے غلط عمل پر ٹوک سکیں۔ اللہ رب العزت نے یہ عظیم خدمت حضرت شاہ ولی اللہ کو ہی تفویض کی کہ وہ اسلام کے وقار کو قائم کرنے کے لیے جرأت کے ساتھ کھڑے ہوں اور دین کی تجدید اور اس کے تحفظ کا فرض انجام دیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ کے اصلاحی اقدامات کے نتیجے میں:

۱- غلط اجتہادات کے دروازے بند ہو گئے اور صحیح شاہراہ حیات کی نشان دہی ہوئی۔

۲- اسلامی نظام حیات اور خلافت علی منہاج النبوت کا ایک مکمل اور جامع خاکہ سامنے آیا۔

۳- علم حدیث کی تجدید ہوئی اور اس کی اشاعت کے کام کا آغاز ہوا۔

۴- قرآن پاک کے تراجم کی داغ بیل پڑی جسے اب تک ناجائز سمجھا جا رہا تھا۔

۵- دین وسیاست میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔

۶- تصوف کی اصلاح کی طرف لوگ متوجہ ہوئے۔

۷- شریعت اور طریقت کا فرق ختم ہو گیا اور شاہ صاحبؒ کی کوششوں سے لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ اصل ریاضت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں کا اتباع کرنا ہے۔

سوچنے کی باتیں

شاہ صاحبؒ آج دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن آپ کی تعلیمات اور آپ کا پیغام آج بھی موجود ہے۔ اس پیغام اور تعلیمات کے مطالعے سے صاف پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے کسی گہری بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت سے کام لے کر اسلام کے عقائد، احکام اور قوانین جو ایک عرصے سے پس پشت ڈال دیے گئے تھے ان کو توانا صورت میں دنیا کے سامنے رکھ دیا اور ساتھ ہی ہانکے پکارے مسلمانوں کو بھی یہ بتا دیا کہ وہ اس اسلام کے نمایندے ہیں، جو اللہ کا دین ہے۔ اس لیے ان کے معاشرے کا فکری، اخلاقی اور تمدنی ڈھانچا ایسا ہونا چاہیے، جس سے ہر دور میں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے زمین ہموار ہو سکے۔

لیکن انسان بہ ہر حال انسان ہے، اس سے کہیں نہ کہیں سہو کا احتمال رہتا ہے۔ چناں چہ اتنی زبردست اصلاحی وانقلابی تحریک اور اس کی پشت پر متقی وصالح ترین لوگوں کے باوجود ہندستان میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوئی اور باہر سے آئی ہوئی انگریز قوم کے سر کامرانی کا سہرا بندھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سلسلے میں ان لوگوں کو سوچنا چاہیے، جو اپنے سینے میں اسلام کا درد رکھتے ہیں تا کہ ان رخنوں کو بند کیا جا سکے، جس سے ملت کو کم زوری وخسران سے دوچار ہونا پڑا۔

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ

(۱۸۳۱-۱۷۸۱)

دنیا میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ایک وہ جو خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور دوسرے وہ جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے کے بہ جائے حالات کا رخ موڑنے کی آخری دم تک کوشش کرتے رہے ہیں۔مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا شمار ایسی ہی باہمت شخصیتوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے زمانے کے سنگین سے سنگین حالات میں بھی ہار نہ مانی، انتہائی ابتلاء وآزمایش کے بعد بھی میدان نہیں چھوڑا، موت کے خونیں پنجے کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر بھی پیچھے قدم نہ ہٹایا اور شاداں وفرحاں میدان جہاد میں جام شہادت نوش فرمایا۔

مولانا ارشاد الحق تھانوی، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے مرشد حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت اسمٰعیل شہیدؒ برصغیر کی تاریخ میں وہ جلیل القدر ہستیاں ہیں جنھوں نے ابتدائی انیسویں صدی عیسوی میں نفاذ شریعت کی تحریک چلائی مگر حسبِ دستور اس وقت کی سیاسی قوتوں نے مزاحمت کی۔ چناں چہ انھوں نے اس تحریک کو جہاد کی تحریک میں تبدیل کردیا اور شمالی ہندستان میں خلافت راشدہ کی طرز کی حکومت قائم کرنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی عدل وانصاف، وہی شریعت، وہی ظالم کے خلاف سینہ سپر ہوجانا اور مظلوم

> کی سرفروشانہ حمایت۔ غرض ہر شعبہ زندگی میں انھوں نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کردی۔ تاہم ۱۸۳۱ میں اپنوں کی غداری کے سبب بالاکوٹ کے معرکے میں شکست ہوئی اور دونوں بطل جلیل بڑے سے بڑے لالچ کو ٹھکراتے ہوئے سر کٹا کر موت کی آغوش میں چلے گئے لیکن باطل کے سامنے سر جھکانا منظور نہیں کیا۔"

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کی قوت روبہ زوال تھی۔ ہر طرف معاشرہ افتراق و انتشار کا شکار تھا۔ ایک طرف مرہٹے شاہی فوجوں پر شب خون مار رہے تھے تو دوسری طرف انگریزی فوجیں کلکتہ سے چل کر دہلی کے لال قلعے تک پہنچ گئی تھیں۔ مغل حکومت انتہائی کم زور ہوچکی تھی۔ اس کم زوری سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے پنجاب پر اپنا اثر جمالیا تھا۔

عام مسلمانوں کے لیے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ وہ بری طرح مایوسی کی دل دل میں پھنسے ہوئے تھے۔ سیاسی طاقت کے زوال کے ساتھ ساتھ ان میں بداخلاقیاں بھی پرورش پا رہی تھیں۔ آپس کے بغض و عناد کے سبب ان میں قومی و ملی جذبات بھی سرد پڑ گئے تھے، کہنے کو ان میں بادشاہ، وزیر، سپاہی، تاجر، امام، مقتدی سبھی لوگ موجود تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب بے جان پتلوں کی طرح اپنی زندگی کے نصب العین سے بے خبر تھے۔

پنجاب میں تو ان کی حالت اور بھی خستہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کی جامع مسجد کو شاہی اصطبل میں بدل دیا تھا۔ وضو کے حوض میں غلاظت ڈالی جاتی تھی اور مسلمانوں سے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کی عزت، آبرو، جان، مال اور مذہب کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ ایسے سخت حالات میں حضرت اسمٰعیل شہیدؒ تقاضائے حق سے مجبور ہوکر فرض حق ادا کرنے نکلے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کا پھر سے بول بالا ہو، دین حق کی لوگوں کو دعوت دی جائے تاکہ ہندستان میں مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو محفوظ رہ سکے۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ۲۹ر اپریل ۱۷۸۹ میں دہلی کے قریب ایک گاؤں پھلت میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ ابھی دس سال کے ہی تھے

کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد آپ اپنے چچا شاہ عبد القادرؒ کے پاس چلے گئے اور وہیں تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جلد ہی حدیث، فقہ، منطق اور دوسرے علوم میں دستگاہ پیدا کرلی۔ اس کے علاوہ تیر اندازی، گھوڑ سواری اور شمشیر زنی کے فن بھی سیکھ لیے۔ قدرت نے بچپن ہی سے تقریر کا ملکہ بھی عطا کیا تھا۔ چناں چہ دہلی کی جامع مسجد میں قرآن وسنت کی تبلیغ واشاعت کے لیے تقریر کرنے کا سلسلہ شروع، چند ہی روز میں چاروں طرف ان کی شہرت ہوگئی۔

تقریر کے ساتھ ساتھ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے یہ بھی سوچا کہ اس وقت ہر طرف برائیوں کا دور دورہ ہے۔ شیطان کے گرگے اپنی قوت کے نشے میں اخلاقی قدروں کو پامال کررہے ہیں۔ ان کے ظلم وستم سے اللہ کی مخلوق تنگ و پریشان ہے، دنیا سے عدل وانصاف کا نام مٹتا جارہا ہے اس لیے ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم عدل وانصاف کے قیام کی جدوجہد کریں، اللہ کی مخلوق کو ظلم وستم کے پنجوں سے نجات دلائیں اور شیطان کی قوت کو پسپا کرنے کے لیے حتی الامکان کوشش کریں۔

یہ تو ظاہر بات تھی کہ بغیر نظام شرعی کے یہ چیز ناممکن تھی۔ مولانا شہیدؒ کی جدوجہد کا اصل مقصد بھی دین کا قیام اور ایک صحت مند معاشرے کا احیاء تھا۔ یہ کوئی نئی اور وقتی تحریک نہیں تھی بلکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اس چراغ کو برسوں پہلے روشن کر گئے تھے، اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کے سینوں میں اپنے دین کے لیے کام کرنے کی تڑپ موجود تھی مگر یہ سب لوگ منتشر تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ ان کو اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جوڑے۔ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے یہی کام کیا۔ ان کی دعوت حق پر بہت سے اولوالعزم لوگ سر دھڑ کی بازی لگا کر ان کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ ایسے لوگوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا عبد الحئیؒ وغیرہم کے نام سرفہرست ہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جن کو کفر کی تاریکی ایک لمحے کو بھی گوارا نہ تھی۔ وہ زندگی کی عظیم ترین سچائی پر ایمان رکھتے تھے کہ ایک اللہ رب العزت اس کائنات کا مالک ہے اور اسلام دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ مسلمانوں نے جب سے اسے چھوڑا ہے تبھی سے وہ تباہی وبربادی سے دوچار ہیں۔ اب اگر وہ پھر اپنے منصب کو بحال کرنا چاہتے ہیں تو اسلام کی تعلیمات کو اپنائیں، اسلام کی بقا کے لیے ایک منظّم جدوجہد کریں اور دین حق کے قیام کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوجائیں۔

اس سلسلے میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ملت کے بگاڑ کی نشان دہی کے لیے "تقویۃ الایمان" کتاب لکھی۔ جس میں شرک و بدعت کی برائیاں کھول کھول کر بیان فرمائیں، جو اس وقت ملت اسلامیہ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چناں چہ ایک جگہ ایمان کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایمان کے دو جز ہیں: (۱) خدا کو خدا سمجھنا (۲) رسول کو رسول تسلیم کرنا۔ خدا کو خدا اس طرح سمجھا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور رسول کو رسول تسلیم کرنا یہ ہے کہ آپؐ کی راہ اختیار کی جائے۔ پہلا حصہ توحید ہے اور دوسرا حصہ اتّباع سنت ہے۔ توحید کی ضد شرک ہے اور سنت کی ضد بدعت ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ توحید اور سنت سے چمٹ جائے، انھیں سینے سے لگائے رکھے اور شرک و بدعت سے بچتا رہے۔ شرک و بدعت ہی متاع ایمان کے لیے گھن ہیں جن سے ایمان جاتا رہتا ہے اور دوسرے اعمال میں خلل پیدا ہوتا ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اس زمانے کے مسلمانوں میں عام طور سے شرک پھیلا ہوا ہے۔ اکثر دعویدارانِ ایمان تک توحید و شرک کے معنی نہیں سمجھتے۔ صرف نام کے مسلمان ہیں ورنہ شرک میں گرفتار ہیں۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ آڑے وقت میں پیروں، فقیروں، پیغمبروں، اماموں، شہیدوں اور فرشتوں کو پکارتے ہیں۔ انھی سے مرادیں مانگتے ہیں، انھی کی منتیں مانتے ہیں اور انھی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ بیماریوں کے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کے نام پیر بخش، مدار بخش رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کسی کے نام کی بدّھی پہنا تا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ غیر مسلم جو معاملہ اپنے دیوی دیوتاؤں سے کرتے ہیں وہی یہ نام نہاد مسلمان انبیاء، اولیاء، ائمہ، شہداء، ملائکہ اور جنوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے سچ فرمایا ہے:

وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُمْ مُّشْرِکُوْنَ O (یوسف:۱۰۶)

(ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیراتے ہیں)۔''

یہ ساری باتیں اس لیے تھیں کہ وہ اصل مرکز سے ہٹ گئے تھے۔قرآن کریم، جو ان کی زندگی سنوارنے کے لیے اللہ رب العزت نے اتارا تھا، کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔اس کو صرف چومنے چاٹنے اور برکت کے خیال سے دیکھا جاتا تھا۔ اس میں کیا لکھا ہے اس کا مسلمانوں سے کیا مطالبہ ہے۔اس پر کس طرح عمل کیا جائے۔ یہ بات عام طور پر مسلمان بھولے ہوئے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم شرک کے دل دل میں پھنسے ہوئے ہو، تمھارے لیے یہ اچھی بات نہیں ہے تو وہ بہ قول مولانا اسمٰعیل شہیدؒ یہ جواب دیتے تھے:

''ہم شرک نہیں کر رہے ہیں بلکہ انبیاء اور اولیاء سے محبت رکھتے ہیں، ان کو پکارنا اللہ ہی کو پکارنا ہے، ان سے مدد مانگنی اللہ ہی سے مدد مانگنی ہے۔ یہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں جو چاہیں کریں ان سے کوئی باز پرس نہیں ہے۔ جتنا ہم ان کو مانیں گے اسی نسبت سے ہم اللہ کے نزدیک ہوتے جائیں گے۔ بہ ہر حال یہ اور اسی قسم کی واہیات باتیں بکی جاتی ہیں جن کا واحد سبب یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کو یہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔''

(تقویۃ الایمان ص: ۱۳۰)

قرآن کہتا ہے کہ اللہ رب العزت پوری کائنات کا مالک ہے۔ انسان کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے اس لیے انسان کو خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ اللہ کے فرمان کو بلا چون و چرا مان لینا چاہیے۔ یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا کوئی مالک نہیں، وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور غیب کی ہر بات جانتا ہے۔ اس سے بندے کی کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں ہے۔ پیر، فقیر، امام سب اللہ کے بندے اور اس کے محتاج ہیں مگر لوگ اپنی جہالت میں ان پیروں فقیروں اور اماموں کو خدا سے بھی مقدم سمجھنے لگے ہیں اور ان کی ایسی تعظیم کرتے ہیں جو اللہ کے لیے مخصوص ہے اور جو سراسر شرک ہے اور اب تو اس سے بھی آگے بات یہاں تک پہنچ چکی ہے:

''اب تو لوگ کافروں کے بتوں کو مانتے ہیں۔ ان کی رسموں پر چل رہے

ہیں مثلاً پنڈتوں سے تقدیر کا حال پوچھنا، بری فال لینا، شیتلا اور مسانی دیوی کو پوجنا، مونا چاری اور کلوا پیر کو پکارنا، ہندوؤں کے ساتھ ہولی اور دیوالی کے تیوہاروں میں شریک ہونا۔ یہ ساری رسمیں مشرکوں اور ہندوؤں کی ہیں، جو مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں شرک کا دروازہ اس طرح کھلے گا کہ وہ قرآن وحدیث کو چھوڑ کر باپ دادا کی رسموں کے تابع ہوجائیں گے اور دوسری قوموں کی تقلید کرنے لگیں گے۔''

(تقویۃ الایمان ص: ۵۴)

جب کہ یہ رسمیں شیطانی ہیں اور اسلام کے خلاف ہیں۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور اس کی دلی تمنا ہے کہ انسان دوزخ کا ایندھن بن جائے۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی جس نے اللہ کی راہ چھوڑ کر شیطان جیسے دشمن کی راہ اختیار کی تو اس نے صریح دھوکا کھایا۔ کارخانہ عالم اللہ رب العزت کا بنایا ہوا ہے وہی مالک الملک ہے، جو چاہے سو کرے۔ اسے ہر طرح اختیار ہے۔ یہ جاننے کے بعد جو نیک وبد ساعتوں، اچھی بری تاریخوں کو پوچھتا پھرتا ہے یا کوّے کے بولنے اور بلّی کے راستے کاٹ جانے سے شگون لیتا ہے اور کاہنوں، نجومیوں وغیرہ سے مستقبل کا حال معلوم کرتا ہے وہ ایک طرح سے شرک میں مبتلا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا ○ (النساء: ۱۱۶)

''اور جس نے شرک کیا وہ راہ سے بہت دور بھٹک گیا۔''

تمام پیغمبر خدا کے پاس سے یہی حکم لے کر آئے کہ صرف اللہ ہی کو اپنا مالک، اپنا رب اور اپنا پروردگار مانا جائے اس کے سوا کسی کو نہ مانا جائے۔ سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ نے بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نعرہ لگایا کہ سوا اللہ کے کوئی معبود نہیں ہے۔ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب اس کی مخلوق ہیں۔ مقرب بندے بھی جو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء سب کے سب اللہ کے بندے ہیں اور بے بس بھی۔ نبی بن کر بشر میں خدائی نہیں آجاتی۔ اس کی فضیلت اس لیے ہے کہ وہ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی اللہ کے دین کے احکام دنیا والوں کو پہنچائے۔ ہم کلمہ پڑھ کر اللہ اور اللہ کے نبی پر ایمان لائے ہیں اس لیے ہمارا فرض ہے کہ جو کام یا عقیدہ یا بات رسول اللہ ﷺ نے خود کی یا کسی کو کرتا دیکھ کر پسند فرمائی اس پر پوری طرح

عمل کریں اور کتاب وسنت کی اتباع دل وجان سے کریں اور کوئی نیا کام اپنی طرف سے یا دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی دین میں نہ نکالیں اس لیے کہ یہ بدعت ہے۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک جگہ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''خدا کا فضل ہے کہ اس نے تمھیں ایک ہی نبی کا امتی بنایا اور ایک ہی کتاب دی کہ تم سب مل کر اس پر عمل کرو، جماعت کو نہ توڑو، سنت کے خلاف کوئی بات نہ کرو اور دین میں نئی نئی راہیں نکال کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بناؤ کہ کوئی اپنی عقل کی تیزی سے ایک مسئلہ نکالے اور کوئی اس کے خلاف دوسرا مسئلہ پیدا کرے، تو اس طرح ایک جماعت دو جماعتوں میں بٹ جائے گی۔ اس طرح جتنے منہ اتنی باتیں۔ پھر جب نئی نئی راہیں نکل آئیں گی تو لامحالہ پھوٹ پڑ جائے گی اور ایکا نہ رہے گا۔ جماعت بے شمار ٹکڑوں میں بٹ کر اپنی طاقت کھودے گی اور دوسری قوموں کا سستا شکار بن جائے گی۔ اس لیے قرآن کی نصیحت پر عمل کرو اور اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو، جس طرح کوئی شخص گڑھے میں گرے ہوئے شخص کو رسّی ڈال کر نکالتا ہے اسی طرح تم بھی گڑھے میں گرے ہوئے تھے اللہ پاک نے آسمان سے رسّی ڈال کر تمھیں نکال لیا یعنی قرآن پاک تمھارے ہاتھ میں دے دیا۔ اب تم اس کو مضبوطی سے تھام لو اور اس کی تعلیم پر عمل کرنے میں سرگرم ہو جاؤ۔ اگر عمل ہی نہ کرو گے تو گڑھے میں پڑے سڑتے رہو گے۔'' (تقویۃ الایمان: ۸۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ گم راہی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک اور حدیث کی تعلیمات کو پس پشت ڈال رکھا تھا اور نئی نئی باتوں، طرح طرح کی رسموں رواجوں اور بدعتوں کو اپنا لیا تھا۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (آل عمران: ۱۰۵)

''تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو جدا جدا ہو گئے اور اپنے پاس صاف صاف احکام آنے کے بعد اختلاف میں پڑ گئے۔ ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔''

یعنی خبردار اپنے دین میں نئی نئی رسمیں، نئے نئے عقیدے اور نئے نئے طریقے نہ نکال لینا اور جماعت میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ اس تنبیہ کے باوجود امت مسلمہ غفلت کا شکار ہوئی۔ چناں چہ مولانا شہیدؒ فرماتے ہیں:

''افسوس مسلمانوں کو جس بات سے روکا گیا تھا انھوں نے وہی بات کی اور آج کوئی معتزلی ہے، کوئی خارجی ہے، کوئی رافضی ہے، کوئی شیعہ، کوئی جبری ہے کوئی قدری، کوئی سہروردی ہے، کوئی نقش بندی، کوئی چشتی ہے تو کوئی حنفی، کوئی شافعی ہے، کوئی حنبلی۔ حکم تو یہ تھا کہ سب مل کر قرآن وحدیث پر عمل کرو اور سنت کے مطابق پکّے سچّے مسلمان بن جاؤ۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح فرقوں میں نہ بٹو، نئی نئی باتیں تراش کر جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو مگر تم اس راہ سے دور ہٹتے جارہے ہو۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔''
(تقویۃ الایمان ص:۸۵)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۱)

''آپؐ فرمادیں کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت فرمائے گا۔''

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب کسی دینی یا دنیاوی بات، عادت یا رسم میں جھگڑا پیدا ہو جائے تو پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کو منصف قرار دیا جائے۔ پھر آپؐ کے حکم کو خواہ مرضی کے موافق ہو یا مخالف، دل و جان سے خوشی خوشی مان لیا جائے۔ تب تو ایمان واسلام کا دعویٰ سچا ہے، اور اگر آپ کے فیصلے سے دل میں ناخوشی ہو یا آپؐ کے حکم کو نہ مانا جائے یا کسی قسم کی چون وچرا کی جائے تو یہ منافقت کی نشانی ہے۔'' (تقویۃ الایمان ص:۹۲)

اس بات کی تشریح مثالوں کے ذریعے کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

''مسلمانوں میں آج ہزارہا نئی باتیں رائج ہیں: مثلاً بسم اللہ اور ختنہ میں

شادی جیسی محفل رچانا، کنگنا باندھنا، منگنی کی رسمیں کرنا، مرد کے مہندی لگانا، سہرا باندھنا، چوتھی منانا، علم وتعزیہ نکالنا، محفل میلاد میں پیدائش کے ذکر پر کھڑے ہونا، گیارہویں منانا، رجب کے کونڈے کرنا، ۱۴ر شعبان کے موقع پر حلوہ پکانا اور آتش بازی چھڑانا، کفن کے ساتھ جانماز بنانا، قبروں پر چادر چڑھانا، تیجہ، دسواں، چالیسواں کرنا، بیٹیوں کو ورثہ نہ دینا، بیماریوں میں ٹوٹکے کرنا، اولاد کے لیے مسجدوں کے طاق بھرنا، شادی بیاہ میں اسراف بیجا کرنا۔ یہ تمام باتیں اور ہزارہا دوسری رواج رسمیں جن پر لوگ عمل پیرا ہیں قطعی دین کے خلاف ہیں۔" (تقویۃ الایمان: ۹۳)

اس طرح مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے قلمی اور تقریری جہاد سے دعوت دین کا آغاز کیا۔ آپ نے جامع مسجد دہلی میں شرک، و بدعت اور غلط رسوم کے خلاف تقریریں کیں اور لوگوں کو اصلاح عقائد کی ترغیب دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاسد لوگ جل اٹھے۔ انھوں نے آپ کی آوازِ حق دبانے کے لیے بادشاہ وقت اکبر شاہ ثانی کے کان بھرے کہ شاہ اسمٰعیل جو شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا ہے۔ مسلمانوں کی عام روش کے خلاف وعظ کہتا ہے اور نبی کریم ﷺ کے تبرکات کا ادب نہیں کرتا۔

یہ سن کر بادشاہ کے کان کھڑے ہوگئے۔ انھیں فوراً دربار میں طلب کر کے استفسار کیا گیا۔ آپ نے بھی بھرے دربار میں حضور اکرم ﷺ کے فضائل اس خوبی سے بیان فرمائے کہ بادشاہ کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے آپ کو بڑی عزت وتوقیر کے ساتھ رخصت کیا۔

حاسدوں کا جب یہ وار خالی گیا تو انھوں نے دوسری چال چلی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریزیڈینٹ کو آپ کے خلاف درخواست پیش کی کہ آپ کا وعظ بند کرایا جائے۔ لیکن آپ نے وہاں بھی نہایت بے خوفی سے اپنے عقائد کی وضاحت کی اور اس طرح آپ کا بال بیکا نہ ہوا۔

جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصے میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب میں سکھ حکومت نے مسلمانوں پر نا قابل بیان مظالم ڈھا رکھے تھے۔ احکام دین کی کھلی توہین کی جاتی تھی۔ بہت سی مسجدوں کو اصطبل بنا دیا گیا تھا۔ مسلمان عورتوں کی عزت وآبرو محفوظ نہیں تھی۔ چناں چہ آپ نے وہاں کی پوری کیفیت جاننے کے لیے پنجاب کا سفر کیا اور بہت سے دردناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی کے بعد ایسے جواں ہمت لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر کے ان کو ان کا

فرض یاد دلایا اور کہا کہ یہ وقت گھر میں بیٹھ جانے کا نہیں ہے۔ جب دنیا میں دین ضعیف ہو رہا ہو، چاروں طرف کفر و بدعت کی ہوائیں چل رہی ہوں، مسلمان بری طرح شیطان کے نرغے میں پھنس گئے ہوں، ان کی ملّی اور سیاسی طاقت اضمحلال کا شکار ہو تو اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ باہر نکلیں۔ مزید ان کے جذبۂ ایمانی کو غیرت دلاتے ہوئے فرمایا:

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی دولت سے بہرہ ور کیا ہے۔ ایمان انسانی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اللہ نے یہ نعمت یوں ہی نہیں عطا کی ہے۔ اگر ہم نے اس کی قدر نہ کی تو یہ چھن بھی سکتی ہے اس لیے اس کے اس احسان کا شکر ادا کرو، اس احسان کا شکر اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اپنی زندگی کو دنیا سے برائیاں مٹانے اور بھلائیاں پھیلانے میں لگا دیں اور ہر وقت اللہ کی راہ میں جان دینے کے لیے تیار رہیں۔ یاد رکھو جو آدمی اللہ کی راہ میں جان دیتا ہے اس کو شہادت کا مرتبہ ملتا ہے۔ شہادت زندگی کی معراج ہے۔ شہید کا مقام بہت اونچا ہے جیسا کہ اللہ رب العزت اپنے کلام میں فرماتا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۵۴)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو۔ ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔''

اس کے علاوہ عالم آخرت میں وہ لوگ جس اعزاز و اکرام سے نوازے جائیں گے اس کا تصور بھی دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔''

ہندستان جیسے ملک میں جہاں مسلمان ایک لمبے عرصے سے عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے جہاد حق کا نعرہ ایک انوکھی بات تھی۔ اس وقت عام لوگ ہی نہیں بلکہ خواص تک اسلام کی بقا سے مایوس ہو چکے تھے مگر مولانا شہیدؒ نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ ان کے خلوص نیت کی بدولت تحریک جہاد کی مقبولیت اور شہرت بڑھتی چلی گئی۔ بہت سے لوگ ولی اللّٰہی تحریک جہاد میں حصہ لینے کے لیے آنے لگے۔ ان کے لیے رسد اور اسلحہ کا انتظام اور پھر ہجرت کا مرحلہ اگرچہ

بڑا کٹھن کام تھا۔ قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ جہاد حق کے لیے بیوی بچوں کو چھوڑنا، زمین جائداد اور دوسرے لوازمات زندگی سے منہ موڑنا ایک سخت آزمایش تھی۔ لیکن جن کو اپنے مقصد سے عشق ہوتا ہے ان کو خطرات کی ذرہ برابر پروا نہیں ہوتی۔ جن کے دل میں دین حق کا سودا سما جاتا ہے وہ بڑی سے بڑی ابتلاء کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جن کو اپنے اللہ کے سامنے پیشی کا خوف ہوتا ہے گھر بار، بیوی بچے مال و دولت کوئی چیز ان کا راستہ نہیں روک سکتی۔ جن کی زندگی کا نصب العین دین کی راہ میں اپنی جان نچھاور کرنا ہوتا ہے وہ بے پروا آگے بڑھتے ہیں اور موت کو گلے لگا کر آنے والی نسلوں کے لیے سنگ میل قائم کر جاتے ہیں۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی پر خلوص قربانیوں سے ملت کو ایک تاب ناک راہ دکھائی۔ ان کے سامنے ظلم و ستم مٹانے کا سوال تھا، عدل و انصاف اور امن و امان کے قیام کا مسئلہ تھا اور اللہ کے دین کی عظمت و شوکت کی سلامتی کا معاملہ تھا۔ یہ ایک نیک جذبہ تھا۔ یہی جذبہ انھیں وطن سے کھینچ کر سرحد کی طرف لے گیا تاکہ وہاں کی آزاد فضا میں رہ کر باطل کا مقابلہ کیا جائے اور اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ چناں چہ اپنے نصب العین کو واضح کرتے ہوئے ان کے مرشد حضرت سید احمد شہیدؒ نے ایک خط میں لکھا تھا:

> "تاج فریدوں وتخت سکندری کی میری نظر میں جو کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنت کا خیال میرے دل میں نہیں آتا۔ صرف یہ آروز ہے کہ اکثر افراد بنی آدم بلکہ دنیا کے تمام خطوں میں رب العٰلمین کے احکام جاری ہو جائیں جنھیں ہم شریعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور اس بارے میں کسی سے کش مکش کا امکان باقی نہ رہے۔ صرف اس کام کی تکمیل مقصود ہے خواہ یہ میرے ہاتھ سے پورا ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے۔ جو ترکیب اس مدعا کے حصول کا باعث بن سکتی ہے اسے بروئے کار لاتا ہوں اور جو تدبیر اس مقصد کے لیے مفید نظر آتی ہے اس سے کام لیتا ہوں۔" (سید احمد شہیدؒ از غلام رسول مہر: ۳۶۶)

دراصل ان لوگوں کے پیش نظر نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا میں نظام اسلامی کا قیام تھا اور ان کی دلی تمنا یہ تھی کہ سارے عالم میں قانونِ الٰہی جاری و نافذ ہو جائے اور شیطان کا

اثر واقتدار مٹتا چلا جائے۔ یعنی خالص اللہ رب العزت کی خوش نودی اور رضا کو بلند کرنا ان کی تحریک کا نصب العین تھا۔ اس سلسلے میں مولانا مسعود عالم ندویؒ فرماتے ہیں:

''سید صاحب مکمل نظام اسلامی کے داعی تھے۔ خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الٰہی کی تاسیس کرنا سید صاحبؒ کا نصب العین تھا۔ سید صاحبؒ کا یہ مقصد اور نصب العین اس قدر واضح وروشن تھا کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجایش نہیں۔ ان کا جہاد خالص اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے تھا۔''

(ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک ص: ۸۰)

مطلب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الٰہیہ کی تاسیس کرنا سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کا نصب العین تھا۔ اسی کے لیے انھوں نے اپنے گھر سے قدم نکالا۔ طویل سفر کی ہمت شکن صعوبتیں، بھوک پیاس کی آزمایش اور نئی سرزمین کی نت نئی ابتلائیں سامنے آتی رہیں مگر ان سب کے باوجود قافلہ حق آگے بڑھتا رہا۔ ایک طرف انگریزوں کی یورشیں تھیں تو دوسری طرف سکھوں کی حکومت کا مقابلہ۔ لیکن ''ہمت مرداں مدد خدا'' پہلے ہی مرحلے میں دشمنوں کو شکست فاش ہوئی۔ مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اس فتح سے مولانا شہیدؒ کی جنگی قابلیتوں کا پتہ بھی چلا۔

حقیقت میں وہ ایک اعلیٰ قسم کے مدبر، ایک عظیم قائد اور ایک بہترین سپہ سالار تھے۔ وہ مصیبتوں سے کبھی نہیں گھبراتے تھے اور اسلام کی سربلندی کے لیے دشوار سے دشوار کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل چھوٹے سے واقعہ سے ہو سکتا ہے:

ان کے زمانے میں کسی غیر مسلم نے دریائے جمنا میں تیراکی کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو چیلنج کیا تھا۔ کوئی مسلمان اس کے مقابلے کو تیار نہ ہوا۔ حضرت اسمٰعیل شہیدؒ نے جب یہ بات سنی تو انھوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور مقابلے پر شان دار کام یابی حاصل کی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت تیراکی کا مذہب سے کیا تعلق! آپ نے تو اسے بھی کفر واسلام کا معرکہ سمجھ لیا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: جب تیراکی میں مسلمان کی شکست کو اسلام کی طرف منسوب کیا گیا اور مشہور یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن یا عبداللہ نے تیراکی کے مقابلے میں گنگا داس یا جمنا لال سے شکست کھائی تو اس سے اسلام کی بدنامی ہوئی اور یہ تاثر قائم ہوا کہ اسلام کے ماننے والے عبداللہ

کوفلاں غیر مسلم نے ہرادیا تو میری غیرت اس کو برداشت نہ کر سکی اور میں نے اسلام کے ناموس کی خاطر چیلنج منظور کر لیا اور اس میں اللہ کے فضل سے کام یاب ہوا، جس سے یہ شبہ زائل ہو گیا کہ اسلام کا ماننے والا دوسروں سے شکست کھا سکتا ہے۔''

اسلام سے محبت، اسلام کو برتر دیکھنے کی تمنا اور دین حق کی حفاظت کے اسی جذبے سے مجبور ہو کر انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں میں جہاد کی مشعل روشن کی، ان کو ایک عظیم مقصد کے لیے تیار کیا۔ رضائے الٰہی کی تحصیل کی خاطر انھیں گھروں سے نکالا اور خود بھی اپنے جان و مال، اپنے اعزہ واقارب اور اپنے نفع ونقصان کی پروا کیے بغیر بالاکوٹ کے میدان جہاد میں پہنچے، جہاں سکھوں کی فوجیں تمام جنگی سامان سے لیس سامنے کھڑی تھیں۔ کثرت کے زعم میں وہ طبلِ جنگ بجا رہے تھے لیکن مسلمان مجاہدین کا عالم یہ تھا کہ کسی کے پاس تلوار تھی نیام ندارد، نیزہ تھا تو ڈھال غائب اور گھوڑا تھا تو زین سے محروم!

عجب حالات تھے، عجب طرح کی لڑائی تھی اور عجب قسم کا مقابلہ تھا۔ لیکن مردمومن کا معاملہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسا اسباب دنیوی یا اپنی طاقت پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ راہ حق میں قدم رکھنے کے بعد چاہے اس کو آگ وخون کے سمندروں سے گزرنا پڑے یا اس پر کامرانیوں کی بارشیں ہوں دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب اس کا دل نہیں توڑتے اور کام یابیاں اس کے اندر کبر وغرور پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ اس کو تو ہر حال میں یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی آزمایش سے بہ خیریت گزر جائے۔ ایمان لانے کے بعد اللہ کی راہ میں جان و مال لگانے کا جو فرض اس پر عاید ہوتا ہے اس کو کہاں تک اس نے انجام دیا اور حاکم حقیقی نے جو مال، جو طاقت، جو فرصت و فراغت اسے عطا کی ہے وہ کہاں تک اس کی راہ میں لگی۔ اس لیے ناسازگار حالات میں بھی وہ اپنی کوششوں کو جاری رکھتا ہے اور اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت اسمٰعیل شہیدؒ یہ باتیں اچھی طرح جانتے تھے اس لیے وہ اور ان کے ساتھی آہنی چٹان بنے میدان شہادت میں اترے۔ دشمن کی توپیں آگ اُگل رہی تھیں۔ سنگینوں کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ تمام میدان میں ہلاکت وموت کا ہنگامہ برپا تھا لیکن اللہ کے یہ

شیر ڈٹ کر موت کا مقابلہ کرتے رہے۔ انھیں اپنی زندگی سے زیادہ اللہ کا دین عزیز تھا۔ بڑی سخت جنگ ہوئی۔ دشمنوں کی صفیں کئی بار ٹوٹیں، کئی بار وہ میدان جنگ سے بھاگے، مقابل پر مجاہدین کی جرأت و ہمت کا خوف طاری ہو گیا لیکن افسوس، عین وقت پر کچھ لوگ اپنی عاقبت نا اندیشی میں دشمنوں سے جا ملے اور جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ حضرت اسمٰعیلؒ بری طرح زخمی ہوئے سر میں گولی لگی لیکن پھر بھی شیر کی طرح دشمنوں پر جھپٹتے رہے اور آخر میں شہادت کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

جنگ چاہے کسی قسم کی ہو، کسی پیمانے پر ہو کسی جگہ ہو، کسی کے بیچ میں ہو بہ ہر حال ہول ناک ہوتی ہے، خوف ناک ہوتی ہے۔ ہزاروں کے لیے پیام موت لاتی ہے، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دیتی ہے۔ قوموں کی تاریخ میں جنگ و جدل کے واقعات کی کمی نہیں، مسلمانوں کے ساتھ بھی بے شمار لڑائیاں ہوئیں وہ ہارے بھی اور جیتے بھی لیکن مومن کی کام یابی اور نا کامی کا معیار یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی ملک فتح کر لیا یا نہیں، کوئی حکومت قائم کر دی یا نہیں، کسی خطۂ زمین پر قبضہ ہو گیا یا نہیں بلکہ اس کا معیار یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں نچوڑ دیں یا نہیں۔

اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر چہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ میدان جنگ میں شہید ہو گئے۔ وہ اپنے گھر بھی واپس نہ آ سکے اور بہ ظاہر وطن سے دور بالا کوٹ کے میدان جہاد میں ان کی داستان حیات ختم ہو گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے خلوص، اپنی جد و جہد اور قربانی سے تاریخِ حق و صداقت میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اسی لیے بہت سے تذکرہ نگاروں نے بالاتفاق لکھا ہے:

> ''تاریخ نے صحابہؓ کے دور کے بعد پہلی دفعہ اس طرز کے لوگ دیکھے ہیں، جو دن میں گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ اس تحریک نے کم و بیش پچاس سال تک سرحد میں جہاد کا علَم بلند رکھا۔ اس کے علم برداروں پر جو آزمایشیں آئیں اور وہ ان میں جس عزم و استقلال اور پامردی و جواں مردی اور صبر و توکل سے گزرے وہ صبر کرنے والوں کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

(۱۹۰۳-۱۹۷۹)

مجاہد حق وصداقت

جس طرح ایک بیمار آدمی کے اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر مختلف لوگ مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں کہ کسی طرح مریض کو افاقہ ہوجائے مگر ناتجربہ کاری کی وجہ سے جوں جوں دوا کی جاتی ہے مرض بڑھتا رہتا ہے، اس لیے کہ دوا مریض کے مزاج اور طبیعت کے مطابق نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس ایک حاذق حکیم جس کی نگاہ مرض کے ہر پہلو پر ہوتی ہے۔ وہ مریض کے مزاج سے بھی واقف ہوتا ہے اور طبیعت سے بھی۔ وہ ہر بات سمجھ کر مرض کی تشخیص کرتا ہے، ایک نپا تلا نسخہ دیتا ہے تو اس کے استعمال سے مریض کے شفایاب ہونے کی امید بندھ جاتی ہے۔

بالکل یہی صورت حال بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کو پیش آئی۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس وقت صورت حال کچھ عجیب سی تھی۔ ہندستان انگریز کا غلام تھا۔ دُنیا کی بساط پر بھی انگریز بری طرح چھائے ہوئے تھے۔ مغربی افکار، سائنس وٹیکنالوجی کی برکت سے پر لگا کر اڑ رہے تھے اور فرنگی بازیگروں کے سحر نے پوری طرح مسلمان ملکوں کو اپنے اثر میں لے لیا تھا۔ خلافت اسلامیہ کا تانا بانا جو ترکی کے ہاتھ میں تھا پہلی جنگ عظیم کے بعد تار تار ہو چکا تھا اور عرب ممالک قومیت کے بت کے پرستار ہو کر ملت واحد کے حصار سے نکلتے جا رہے تھے۔ وہ مغربی فلسفہ، مغربی تہذیب اور مغربی اندازِ فکر سے مرعوب ہو کر اپنا قومی تشخص کو کھو بیٹھے تھے اور ان

کے احساس کم تری کا اس وقت یہ عالم تھا کہ ان کو اپنی تاریخ کے کارنامے بیان کرتے ہوئے بھی شرم آنے لگی تھی، وہ اپنی روایات، اپنے عقائد اور اپنی اخلاقی اقدار کی نفی کرنے تک کو تیار تھے۔

ادھر ہندستان میں انگریزی تسلط نے مسلم معاشرے کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے تھے۔ برطانیہ عظمیٰ کی عظمت کا نقش ہر چھوٹے بڑے کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ حاکم قوم کی ہر ادا نے ملت کے نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ بہ قول مولانا عبدالماجد دریا آبادی:

> ”اس وقت مسلمان قوم کے علم و فضل کا کمال یہ قرار پایا کہ کسی طرح انگریزی زبان بولنا آجائے، تلفظ انگریز جیسا ہو جائے۔ تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریز کی تقلید میں خاندان مشترکہ کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزا سے قطع تعلق کرلیا جائے۔ شرافت اور عزت کا منتہائے خیال یہ قایم ہوا کہ ہر ممکن طریقے سے انگریزی عہدے حاصل کیے جائیں۔ عقل و دانش کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انگریز کے ہر قول پر بے چون و چرا ایمان لے آیا جائے۔ انگریزی قانون، انگریزی سائنس اور انگریزی فلسفے کو ہر قسم کی تنقید سے ماورا سمجھا جائے اور اپنے علوم و فنون، اپنے شعائر و رسوم اور اپنے خیالات و عقائد کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزی بت کے صنم دل ربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ پردے کی رسم اس لیے غلامیِ نسواں کے مترادف معلوم ہونے لگی کہ انگریزی خواتین کا شعار بے حجابی کا تھا۔ عرش کے انکار پر سب سے قوی دلیل یہ قایم ہوئی کہ انگریزی ہیئت و جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، شیاطین، جنات اور ملائکہ کے وجود کے ابطال کے لیے یہ دلیل قطعی نکلی کہ انگریز سائنس داں کسی آلے کی مدد سے اس کا مشاہدہ نہ کر سکے۔“ (رسالہ طلوع اسلام)

ظاہر ہے یہ کیفیت مرعوبیت کی تھی، جو زبردست غلامانہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ ایک عام آدمی اس ماحول میں نماز پڑھ سکتا ہے، روزے رکھ سکتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ اس طرح اس کا ملی اور دینی تشخص دھیرے دھیرے کتابوں تک محدود ہوتا جا رہا تھا۔

ہندو احیاء پرستی اور مسلمان

دوسری طرف ملک کے طول وعرض میں ہندو احیاء پرستی کی ابتداء ہو چکی تھی، غیر مسلم حضرات دو ہزار سال کی لمبی مدت کے بعد جاگ رہے تھے۔ ان کی نظر 'ہندو' ہندی، ہندستان کی طرف لگی ہوئی تھی، جس کے لیے ان میں کچھ تحریکیں علی الاعلان اور کچھ در پردہ کوشاں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ تخت طاؤس کے نیچے سے سرکتے ہی مسلمان کٹی پتنگ کی مانند اس وقت بے آسرا ہے۔ پس ماندگی، جہالت اور غربت نے بھی اسے گھیرے میں لے رکھا ہے اگر ہماری قوم اس موقع سے فائدہ اٹھالے تو سیاسی اور معاشی میدان سر کر سکتی ہے۔ ویسے بھی ہماری اکثریت ہے اور پھر انگریز کی سرپرستی موجود ہے۔ بس ہمیں ایک نصب العین طے کر کے اٹھنا چاہیے۔

چناں چہ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۴ میں یکا یک پورے ملک میں شدھی کا سلسلہ چل پڑا اور مسلمانوں کو ہندو بنانے، دامے درمے قدمے کسی بھی صورت سے انھیں مذہب بدلنے پر مجبور کیا جانے لگا۔

یہ وقت بڑا نازک تھا۔ ایک طرف مغربی تمدن کی چمک دمک آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر رہی تھی تو دوسری طرف مدت ہائے دراز سے احیائے اسلام کی راہِ مستقیم سونی پڑی تھی۔ مسلمانوں کی رگوں میں حرارت دین کا لہو جم چکا تھا۔ ملت کے سامنے ہر ہر قدم پر مصائب و ابتلاء کے پہاڑ کھڑے ہوئے تھے اور پھر اس پر شدھی کی تحریک الاماں والحفیظ! یہ وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے اور ایک دوسرے کا منہ تکتے رہنے کا نہیں تھا۔ چناں چہ مریض ملت کے علاج کے لیے ہمدردان ملت اور دانش وران قوم نے مختلف تجاویز رکھیں۔ جن میں ایک تجویز یہ تھی کہ ـــــ

> ''مسلمان ہجرت کر کے افغانستان چلے جائیں کہ اس طرح دار الاسلام میں پہنچ کر سکون سے وقت گزار سکیں گے۔''

اس تجویز کا کھوکھلا پن تو ویسے ہی ظاہر ہے کہ یہ کوئی ٹھوس قدم نہیں تھا۔ نہ اس سلسلے میں پہلے سے یہ سوچا گیا تھا کہ ملک کے دس کروڑ مسلمان افغانستان میں کھپ بھی جائیں گے یا نہیں اور ان کے جانے کا انتظام کیا ہوگا؟ وہ وہاں پہنچ کر کس طرح رہیں گے؟ کیا کھائیں گے اور خود

افغانستان اس بوجھ کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں! بس ایک دیوانے کی بڑھتی، جس پر چند سر پھرے ہی عمل کر سکے تھے کہ اسی اثناء میں اللہ نے سمجھ عطا کر دی اور اس تجویز کو واپس لے لیا گیا۔

کسی نے ملت کے ذہن کو ہموار کر کے غیرت دلانی چاہی کہ وہ جوالا مکھی کی طرح پھٹ کر قصر حکومت کو تہس نہس کر دے اور انگریز کو اس ملک سے بھاگنے پر مجبور کر دے۔ لیکن اس تجویز کو ۱۸۵۷ میں پہلے ہی آزمایا جا چکا تھا۔ اس وقت تو اپنا زور، اپنی حکومت، ہتھیار سب کچھ تھا اور اب تو کارتوس ہی خالی تھا، پھر بھلا کیا نتیجہ نکلتا۔

کچھ اور دردمندان ملت کا کہنا تھا کہ ہندو مسلمان اس وقت ایک کشتی میں سوار ہیں، دونوں کا نصب العین ایک ہے۔ یعنی انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنا؛ اس لیے ان کے ساتھ مل جل کر اپنے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے اور ملک کو آزاد کرانا چاہیے۔ اس وقت چوں کہ کانگریس ملک کی وہ واحد جماعت ہے، جو انگریز کو ہندستان سے نکالنے کی کوشش کر رہی ہے اس لیے مسلمانوں کو اسی کے ساتھ مل کر آزادی کی لڑائی میں حصہ لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر متحدہ قومیت کے دلائل فراہم کیے گئے اور منبر و محراب سے ''قومیں اوطان'' سے بنتی ہیں کی صدائیں بلند کی گئیں اور ملت کو یقین دلایا گیا کہ ـــــ

> ''اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان میں ترک موالات کے میدان میں بلکہ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیں تو دنیا کی کون سی طاقت ہے، جو آپ کو شکست دے سکے گی؟'' (خطبات آزاد)

یہ ہمارے ملک ـــــ غیر منقسم ہندستان کے ـــــ ایک بڑے مسلمان رہ نما کے خطبے کا اقتباس ہے جس سے ظاہر ہے کہ ان کی رائے میں کانگریس کی چھتر چھایا میں آزادی کی جدو جہد میں حصہ لینا ایمان کا درجہ رکھتی تھی، جس کو اپنانے کا مشورہ آں محترم نے ملت کو دیا تھا۔

اس سے بھی دل چسپ واقعہ مولانا عبید اللہ سندھی کا ہے، جس کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے الجمعیۃ کے مدنی نمبر میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''مولانا ہمیشہ ننگے سر رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ موصوف دلّی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا: مولانا!

آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ غصہ، کچھ حسرت کے ملے جلے لہجے کے ساتھ فرمایا: میری ٹوپی تو اس دن اتر گئی، جس دن یہ لال قلعہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب جب تک یہ مجھے واپس نہیں مل جاتا میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں۔" (الجمعیۃ مدنی نمبر ص: ۱۳۲)

مولانا عبید اللہ سندھی عدیم النظیر دل و دماغ اور غیر معمولی صبر و ثبات کا مجسمہ تھے مگر اس واقعہ سے ان کی انتہا پسندی کی غمازی ہوتی ہے۔

دیکھنے میں یہ کتنی خوش آئند بات تھی کہ کتنے سارے علمائے کرام اور اصحاب دین و دانش ایک مرکز پر جمع تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی افسوس ناک پہلو تھا کہ آزادی کے حصول کے سوا ان کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا۔ نہ ان کو یہ یاد رہا تھا کہ مسلمان کی اصل پوزیشن کیا ہے؟ نہ انھیں یہ احساس تھا کہ خود ہماری ذمے داری کیا ہے؟ دار العلوموں کے کلید بردار ہونے کی حیثیت سے وہ کیسے نازک مقام پر کھڑے ہیں اور یہ جو اس ملک کے شہر شہر، بستی بستی اور محلے محلے میں برائیاں پھیل رہی ہیں، اسلامی اقدار کی پامالی ہو رہی ہے اگر ان کے انسداد کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا اور کل قیامت کے دن ہمیں کس مقام پر کھڑا ہونا پڑے گا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے لیکن اگر مسلمان کے سامنے دعوت حق کا مقام آجائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کی بہت سی مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں مگر میں یہاں اختصار کے ساتھ صرف دو حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت یوسفؑ قید محن میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ اسی بیچ میں دو قیدی آکر آپ سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ آپ خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے ان کے سامنے دعوت حق پیش کر دیتے ہیں اور تعبیر بتانے کی بات موخر رکھتے ہیں۔

ایسے ہی حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں بنی اسرائیل کی قوم فرعون کے جبر و ظلم کے شکنجے میں کسی ہوئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ اللہ رب العزت کی طرف سے فرعون کے دربار میں پہنچتے ہیں اور اپنی قوم کی آزادی کے مطالبے کو موخر کر کے فرماتے ہیں:

وَ قَالَ مُوْسٰی یٰفِرْعَوْنُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ حَقِیْقٌ عَلٰۤی اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۝ (الاعراف: ۱۰۴، ۱۰۵)

''موسیٰؑ نے کہا: اے فرعون! میں کائنات کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔ میں تم لوگوں کے پاس تمھارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔''

اس آیت شریفہ سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے آپ نے فرعون کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی پھر اس سے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہی سنت کا طریقہ ہے اور رہتی دنیا تک مومن بندے کے لیے زندگی کا یہی لائحۂ عمل رہے گا کہ پہلے دعوت حق دے اور پھر پنجہ ظلم و ستم سے رہائی کی جدوجہد کرے۔ کیوں کہ سلطنت و آزادی، مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے۔

لیکن ہندستان میں اس اصول کے بالکل برعکس عمل ہو رہا تھا کہ پہلے آزادی کا حصول ہو اور وہ بھی دوسروں کے طفیلی بن کر جب کہ دنیوی اعتبار سے بھی اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ یہ پچھ لگّو گروہ دوسرے درجے کا شہری بن جائے۔ آج جس کو تجربے نے ثابت بھی کر دیا ہے کہ وہی گروہ جو حق پرستی کا علم بردار سمجھا جاتا تھا اس میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو چند ٹکڑوں کے لیے دین فروشی کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

مسلم لیگ اور مسلمان

اس کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت جو ''مسلم لیگ'' کے نام سے برپا ہوئی تھی، اس کے اربابِ حل وعقد کا کہنا تھا کہ ہندستان کا جھگڑا آزادی یا غلامی اور امیری غریبی کا نہیں ہے بلکہ دو معاشرتوں، دو کلچروں اور دو عقیدوں کی ٹگ آف وار (Tug of war) ہے۔ ہندو قوم مدتوں سے مسلمانوں کے زیر نگیں رہی ہے۔ اب وہ جاگ رہی ہے۔ اس کو مسلمانوں سے فطری مخاصمت ہے۔ وہ اس وقت اپنے کلچر کو زندہ کرنے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ کانگریسی ہو یا

مہا سبھائی، آریہ سماجی ہو یا سناتنی (सनातनी) سب کی ایک سی ذہنیت ہے، ایک نصب العین ہے۔ اس کے پیشِ نظر ہندستان کا جو مستقبل کا نقشہ ہے اس میں مسلمان کے لیے بہ حیثیت مسلمان کوئی جگہ نہیں۔ یہ لوگ ہندستان کی تاریخ سے مسلمانوں کے عہد حکومت کے آٹھ سو سال محو کر دینا چاہتے ہیں، جس سے کہ اقلیت اکثریت میں مدغم ہو کر قومی دھارے کے ساتھ بہے تاکہ یہ روز روز کے مطالبات کا جھگڑا ختم ہو جائے۔

اس متعصب ہندو ذہنیت کو دیکھ کر مسلم لیگی رہ نماؤں کا کہنا تھا کہ ہم شروع ہی سے ہندو مسلم دو قومی نظریے کو مان کر کیوں نہ چلیں تاکہ ملک کی آزادی کے وقت حکمراں جماعت کے سامنے ملک کے ایک حصہ کا مطالبہ رکھیں اور اسلامی روایات کے مطابق مسلمان اس حصہ میں حکومت کا نظام چلا سکیں۔

بہ ظاہر قومی نقطۂ نظر سے یہ خیال ٹھیک معلوم ہوتا تھا لیکن اس سے دونوں قوموں میں منافرت پھیلنا بھی قدرتی تھا۔ چناں چہ قومی کش مکش کا آغاز ہوا۔ تاریخ کے اوراق بدلے گئے۔ اردو ہندی کی رسہ کشی شروع ہوئی۔ اپنے اپنے پلیٹ فارموں سے ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اچھالی گئی اور بات اتنی بڑھی کہ دونوں قومیں جو صدیوں سے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھیں باہم دست و گریباں ہو گئیں اور آخر کار ۱۹۴۷ کو وہ دن بھی آیا کہ ایک گھر کے دو گھر ہو گئے۔ ہندستان کے سامنے تو صرف آزادی کا سوال تھا سو حل ہو گیا مگر پاکستان جو آگ و خون کے سمندر پار کرنے کے بعد اس لیے بنایا گیا تھا کہ وہاں اسلامی نظام قایم ہوگا، اسلامی کلچر کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا اور وہ دنیا کو اسلامی روشنی دکھائے گا۔ مگر دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ خواب آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

سوشلسٹ مسلمانوں کا نصب العین

ایک تیسرا طبقہ سوشلسٹ لوگوں کا تھا، جس کا خیال تھا کہ تہذیب و تمدن لایعنی چیزیں ہیں۔ اصل چیز بات ملت کے موجودہ تقاضے ہیں انھیں دیکھنا چاہیے۔ اس وقت نوّے فی صدی مسلمان غریب ہے۔ ہمیں کانگریس کا ساتھ دے کر معاشی اصلاح پر دھیان دینا چاہیے۔ اس وقت اگر چہ کانگریس پر سرمایہ دارانہ ذہنیت کے لوگ قابض ہیں، جس کے باعث اردو ہندی کے

جھگڑے، اکثریت اقلیت کے مسائل، اشدھی تحریک اور وِڈیا مندر اسکیموں کے پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں۔ اگر مسلمان محنت کش طبقہ، ہندو ہم پیشہ طبقہ سے مل جائے تو کانگریس کی موجودہ قیادت کو بدلا جا سکتا ہے اور ایک ایسے متحدہ ہندستان کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے جہاں نہ اردو ہندی کی رسہ کشی ہوگی نہ مذہب و کلچر کی کش مکش کیوں کہ محنت کش عوام کو ان مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

کمیونسٹ حضرات کا موقف

کمیونسٹ حضرات اس سے بھی دور کی کوڑی لائے۔ ان کا نظریہ تھا کہ یہ مذہب وذہب کوئی قابل قدر چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ماضی میں خون خرابے ہوتے رہے ہیں اور آج بھی اس کو وسیلہ بنا کر چالاک قسم کے لوگ اپنا الّو سیدھا کر رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو مذہب ایک طرح کی افیون ہے جسے سرمایہ دار، عوام کو طبقاتی انتشار میں مصروف رکھنے کے لیے دیتے ہیں تاکہ وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے رہیں۔ انسان کی اصل ضرورت پیٹ ہے۔ پراگندہ روزی سے دل بھی پراگندہ رہتا ہے اس لیے ہمیں مذہب کو بالائے طاق رکھ کر روٹی حاصل کرنے کی جدو جہد کرنی چاہیے اور بہ قول اقبال:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

چاہے اس کے ساتھ اخلاق، تہذیب اور کلچر کے تانے بانے بھی جل جائیں، پروا نہیں کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے، یہ جذبات کے عقل و وجدان پر غالب آنے کا مسئلہ تھا۔ جب خواہشات، دل و دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کو کبھی صحیح راستہ نہیں مل سکتا اور یہ چیز مسلمانوں کے لیے قیامت تک کے لیے ناقابل قبول ہے کیوں کہ:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

(اقبال)

مسلمانوں کی دینی واخلاقی کیفیت

سطور بالا میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انگریزوں کے دور کا پس منظر کیا تھا، اس میں مسلمانوں کے رہ نما کس کس طرح ملت کی کشتی کو پار لگانا چاہتے تھے۔ اب یا تو وہ معاشی، سماجی اور دینی کم زوریاں جو پوری ملت کو گھیرے ہوئے تھیں ان کی نظر سے پوشیدہ تھیں اور وہ بیمار ملت کے علاج کا خواب دیکھ رہے تھے۔

حالاں کہ اس وقت پوری مسلم سوسائٹی انتشار کا شکار تھی۔ پرانے عقائد پر ضربیں لگ رہی تھیں، ظاہری اعمال ورسوم کو اصل مذہب سمجھ لیا گیا تھا، کتاب وسنت کی جگہ بزرگوں کے اقوال و احوال جڑ پکڑ رہے تھے۔ عوام میں قبر پرستی، عرس، فاتحہ، علم، تعزیہ کا زور تھا۔ خواص میں مناظرے بازی اور بحث ومباحثے کا بازار گرم تھا، غور وفکر کا کوئی مقام کہیں نہیں تھا۔ مختلف مذاہب فقہ کی بنیادوں پر امت مسلمہ الگ الگ فرقوں میں بٹ کر رہ گئی تھی، شخصیت پرستی نے اس کو ایک بند گلی میں لاکر کھڑا کر دیا تھا جہاں آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ہمارے ملّی رہ نماؤں کا المیہ یہ تھا کہ وہ اس جم غفیر کو ''خیر امت'' کے بہ جائے ایک اقلیتی گروہ سمجھ بیٹھے تھے اور اس تشخیص کے سہارے آزادی کے بعد آئین ساز اسمبلی میں نمایندگی اور چند عہدوں کے حصول کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

حالاں کہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب باطل نظریات وافکار چاروں طرف محیط ہوں، جب خیالات کو ڈھالنے اور اخلاق وکردار کے ماحول پر شیطان کے ایجنٹوں کا قبضہ ہو، جب بے حیائی اور عریانیت سے لبریز پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا پر فرائیڈ کے شاگردوں کا تسلّط ہو، جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسا معاشی نظام چھایا ہوا ہو، جو حلال وحرام کی قیود سے نا آشنا ہو۔ جب تمدن وتہذیب کے طور وطریق ڈھالنے کا کام ایسے افراد کر رہے ہوں جو آخرت فراموش، مادہ پرستانہ اور ملحدانہ تصورات کے داعی ہوں، جب حکومت اور سوسائٹی کی رہ نمائی ایسے لوگ کر رہے ہوں جن کا دل خدا کے خوف سے یکسر خالی ہو تو ایسے نظام، ایسی تہذیب، ایسے ماحول کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم اپنے آپ کو اس کے عبرت ناک نتائج سے کیسے بچا سکتے تھے۔ یہ نظام جس جہنم کی طرف جا رہا تھا اسی طرف وہ دنیا کے

ساتھ ہمیں بھی گھسیٹ کر لے جائے گا، جس سے ہماری دنیا کے ساتھ ساتھ ہماری آخرت بھی تباہ ہونے کے امکانات عیاں تھے۔

اللہ کی حکمت

لیکن خدا کی حکمتوں کو کون جانتا ہے؟ اسی ماحول میں اس نے ایک مردِ سعید کو پیدا کیا۔ اس مرد سعید کو دنیا مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نام سے جانتی ہے، جس نے بھری انجمن میں نعرۂ حق بلند کر کے ہر کس و ناکس کو بتایا کہ مسلمان اللہ کے دین کا امین ہے۔ اسے دنیا میں کلمۂ حق کی اشاعت کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے پہلا کام برائیوں کو مٹانا اور بھلائیوں کو پھیلانا ہے۔ اس کی تمام تر قوت اس راہ میں لگنی چاہیے۔ ملک آزاد نہیں ہوتا، نہ ہو، مسلمانوں کو کوئی حصہ زمین نہیں ہیں، نہ ملے مگر مسلمان اسلام کی دی ہوئی لائنوں ہی پر چلیں، اسی میں ان کی کام یابی ہے۔ ایک موقعے پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا:

> ''تمام مسلمانوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ بہ حیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے ہے، جس کے لیڈر انبیاء علیہ السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظامِ فکر اور ایک خاص طریق کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام فکر اور طریق کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہ السلام کی سیرتوں سے ملتا ہے، ہم خواہ کسی زمانے میں ہوں ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے مقصد اور نصب العین وہی ہے اور وہی ہوگا، جو انبیاء علیہ السلام کا تھا اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے، جس پر انبیائے کرامؑ ہر زمانے میں چلتے رہے ہیں۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرز عمل اختیار کریں گے تو گم راہ ہو جائیں گے۔'' (مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش ص:۱۰۱)

ہندستانی مسلمانوں کا مقدمہ اور اس سے متعلق جدو جہد کی گزشتہ صورتیں اگر کسی انصاف پسند کے سامنے پیش کی جائیں اور معلوم کیا جائے کہ ان مختلف نظریات اور نظام ہائے فکر

میں صحیح، قابل عمل اور عالم فانی سے عالم جاودانی تک کے لیے کون سا راستہ فلاح وکام یابی کا ہے تو وہ بے ساختہ مولانا مودودیؒ کے بتائے ہوئے طریقہ کار کو صاد کرتا ہوا نظر آئے گا۔

تاریخ کو بنانے اور بگاڑنے میں اشخاص کا بہت اہم رول ہوتا ہے اور شخصیت جتنی بڑی ہوتی ہے اس کا قول وعمل تاریخ پر اتنا ہی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ اگر کوئی بڑی شخصیت بھولے پن میں کوئی غلط سمت اختیار کر لے یا جان بوجھ کر ان دیکھے راستے پر چل پڑے تو بہ ہر حال نتائج سامنے آ کر رہتے ہیں اور سچ پوچھیے تو آزادی سے پہلے قومی رہ نماؤں نے جن لائنوں پر کام کیا تھا اس کے کڑوے کسیلے پھل آج سب کے سامنے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کی جھلک آپ دیکھتے چلیے:

تحریک قیام پاکستان کا کھوکھلا پن

پاکستان کا نعرہ جنت ارضی سمجھ کر لگایا گیا تھا اور یہ امید وابستہ کی گئی تھی کہ یہ ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ثابت ہوگا اور وہاں اسلامی معاشرت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی وہی مغربی تہذیب، وہی بڑھتی ہوئی بے حیائی، وہی ظاہر فریبیاں، وہی قومیت کے نعرے، وہی بے دینی کی ابھرتی ہوئی لہریں اور وہی سیاست میں شخصی اجارہ داری اور صوبائی تعصب جو پہلے تھا سو اب بھی ہے۔ اب ہم سوچ سکتے ہیں کہ ہم نے کیا کھویا، کیا پایا؟ اسی لیے مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا:

> ”ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ خود نظام کو بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو رہے یہی اور انھی الحادی اصولوں پر چلتا رہے مگر اسے مغربی نہ چلائے، مشرقی چلائے یا انگریز نہ چلائے، ہندستانی چلائے یا ہندو نہ چلائے، مسلمان چلائے۔ ہمارے نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سور تو بہ ہر حال سور ہی ہے، وہ اپنی ذات میں ناپاک ہے خواہ اسے

غیر مسلم باورچی پکائے یا مسلمان باورچی، بلکہ مسلمان باورچی کا سور پکانا اور بھی زیادہ افسوس ناک اور گم راہ کن ہے کیوں کہ بہت سے بندگان خدا حتی کہ اچھے خاصے پرہیز گار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا سور اس اطمینان سے کھالیں گے کہ مسلمان نے پکایا ہے اور اگر اس دوران میں وہ چمچے کی ہر گردش پر بہ آواز بلند بسم اللہ پڑھ دیا کرے اور محفل طعام کے وقت کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کردے جو عام طور سے اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں تو اس کی سنگینی اسے اور بھی زیادہ پر خطر بنا دیتی ہے۔''

(جماعت اسلامی کی دعوت ص: ٦،٧)

چناں چہ پاکستان کی کہانی کچھ ایسی ہی ہے کہ ملک تو لے لیا تھا، اسلامی روایات کو زندہ کرنے کے لیے مگر آج تک لوگ چل رہے ہیں دوسرے کنارے پر۔ مولانا مودودیؒ نے اس چیز کو محسوس کیا اور نہایت بے باکی سے حکمراں طبقے کو للکار کر کہا:

''جب تم نے مسجد بنانے کے لیے یہ زمین لی تھی اور باہر مسجد کا بورڈ بھی پاکستان کے نام سے لگا دیا تو اندر شراب خانہ کھولنا زیب نہیں دیتا۔ تم نے مسلمانوں سے اسلامی اسٹیٹ بنانے کا وعدہ کیا تھا اسی کے لیے ان سے سر دھڑ کی بازی لگوائی تھی اور پہلی مقصود کی محبت میں وہ خاک وخون کے بحر ذخار سے گزر کر یہاں پہنچے تھے اس لیے اے ریاست خداداد پاکستان کے حکمرانو! تم اپنے وعدہ کو پورا کرو مگر افسوس! اقتدار کے نشے میں انھوں نے سنی ان سنی کردی۔''

یہ لوگ پرانے حاکموں سے مختلف نہیں تھے۔ نئے انقلاب میں صرف شخصیتیں بدلی تھیں، دماغ وہی تھے۔ گوروں کی جگہ کالوں نے زمام حکومت سنبھالی تھی لیکن ان کا ذہن مغربی خیالات کا پروردہ تھا۔ کہنے کو وہ مسلم حکمراں تھے مگر مزاج کے اعتبار سے شعائر اسلامی کے انہدام میں غیر مسلم حکمرانوں سے کہیں زیادہ جری اور بے باک تھے۔ جیسا کہ خود مولانا نے تقسیم سے پہلے آثار وقرائن کو دیکھ کر کہا بھی تھا:

''اس ذریعہ سے اقتدار تو انھی لوگوں کو ملے گا، جو مردم شماری کے رجسٹر میں

چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات کے اعتبار سے جنگجو اسلام کی ہوا تک نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں کھڑے تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر۔ کیوں کہ وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا لیبل لگا ہوا اسلامی انقلاب روکنے میں اس سے بھی کہیں جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید و جرمانے کی سزا دیتی ہے وہ مسلم حکومت ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی نمازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ رہیں گے۔''

(اسلامی حکومت کس طرح قایم ہوتی ہے ص: ۲۵،۲۶)

اور ہوا بھی یہی، مولانا نے جیسے ہی اسلامی دستور کی مہم شروع کی حکومت کی مشنری حرکت میں آگئی۔ اس نے پہلے تو مولانا کو گرفتار کر کے آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا، اس پر بھی یہ آواز نہ دبی تو دوبارہ ۱۹۵۳ میں قادیانی مسئلے کی آڑ لے کر پھانسی کی سزا سنادی۔

یہ معمولی سزا نہیں تھی۔ مگر مولانا اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹے، وہ جانتے تھے کہ زندگی ملی ہے تو موت بھی آنی ہے۔ اگر اب اس کا وقت آ گیا ہے تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی موت کو نہیں روک سکتی اور اگر خدا ہی کو منظور نہیں ہے تو ارباب حکومت چاہے کچھ بھی کر لیں وہ انھیں پھانسی پر نہیں چڑھا سکتے۔

اللہ کی حکمتیں بھی عجیب ہیں۔ وہ اپنے بندوں کے دعوئ ایمان کو دیکھتا ہے اور جب بندہ راضی بہ رضا کا مصداق ہوجاتا ہے تو وہ اس پر مہربان ہوجاتا ہے۔ یہاں بھی قدرت خداوندی نے اپنا کام کیا اور حکومت نے اپنی مصلحت سے پھانسی کی سزا کو قید بامشقت میں بدل دیا اور پھر اپریل ۱۹۵۵ میں مولانا کو رہا کر دیا۔

گرفتاری، قید تنہائی، پھانسی اور رہائی کے مراحل سے گزر کر مولانا نے پھر اسی ماحول میں آکر دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیا۔

آزاد ہندستان کی حالت زار

ایسے ہی حالات میں ہندستان میں جن لوگوں نے کانگریس کا ساتھ دیا تھا اللہ نے ان کو زندگی ہی میں دکھلا دیا کہ اپنے فرض منصبی کو پس پشت ڈال کر اور دعوت حق کی ڈیوٹی کو بھلا کر جو راستہ اختیار کیا گیا تھا اس کا نتیجہ قومی، ملی اور دینی ہر طرح خراب نکلا۔ آج ہر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت اردو کا خاتمہ، نوکریوں سے مسلمانوں کا اخراج اور نس بندی اور خاندانی منصوبہ بندی کے حملے، دارالعلوموں کی تلاشیاں، بار بار فرقہ وارانہ فسادات کا وقوع، عورتوں کی عصمت دری، بچوں اور بوڑھوں تک کا قتل عام اسی اپنی حکومت اور اسی آزادی کے زمانے میں ہوا، جس کو ہر درد کی دوا سمجھا گیا تھا۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ ہمارے رہ نماؤں نے نہ تو اپنے منصب کی سلسلے میں کچھ سوچا تھا اور نہ مستقبل کا اندازہ کیا تھا انھوں نے شاید تاریخ عالم سے سبق بھی نہیں لیا تھا کہ قوموں کی باہم کش مکش کے مناظر سامنے آتے۔

ان کے مقابلے میں مولانا مودودیؒ دونوں مکاتب فکر کے لوگوں سے الگ رائے رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس ملک میں ''خیر امت'' کی حیثیت سے اٹھیں، دنیا کے سامنے وہ اصول پیش کریں جن میں خود اپنی اور سب انسانوں کی فلاح ہے۔ قوم پرستانہ سیاست ہو یا لا دینی جمہوریت ان میں سے کوئی بھی بنی نوع انسان کے درد کا مداوا نہیں ہے۔

چوں کہ خدا ہمارا مالک ہے اور دنیا کے تمام انسانوں کا بھی وہی خالق ہے، اس لیے ہمیں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا چاہیے اور ہماری معاشرت، ہمارا تمدن، ہمارا نظام حکومت، ہمارے قوانین، ہماری عدالتیں اور ہماری جدو جہد غرض کہ تمام باتیں ان اصولوں کی پابند ہوں، جو خدا نے ہمارے لیے مقرر کی ہیں۔ اس کام کے لیے اس نے ہمیشہ اپنے رسول بھیجے۔ سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ تشریف لائے جنھوں نے اسلامی اسٹیٹ کا ماڈل بنا کر دکھا دیا۔ آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے اس نقشے پر حکومت چلائی۔ جس میں آقا و غلام، کالے گورے سب برابر تھے، انصاف کا ہر طرف دور دورہ تھا، حاکم خدا سے ڈرنے والے اور عوام انتہائی متدین جن کے بہترین کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ آج پھر اسی نقشہ کار کی ضرورت ہے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ دنیا کے عام انسانوں کو بھی اسی نظام حق کی پیاس ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے موجودہ نظام کے مقابلے میں اسلام کا نظام اخلاق، نظام عبادت، نظام حکومت اور نظام معیشت کے امتیازکی واضح طور سے نشان دہی کی اور ایک ایسا نقشہ کار پیش کیا، جو کے اس دور کی ضرورت ہے۔ مولانا نے ایک نہایت جان دار، انقلابی اور موثر لٹریچر تیار کیا، تاکہ ملت اسلامیہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد آجائے اور وہ اپنے منصب کو پہچان سکے۔

اس کے علاوہ لمبے غور وفکر اور مشاورت اور تبادلۂ خیال کے بعد ۲۲/اگست ۱۹۴۱ کو جماعت اسلامی کی تشکیل کی اور اس کے لیے ایک دستور مرتب کیا اور مختلف جماعتوں، ان کے رہ نماؤں اور ملک کے عوام تک دعوت حق پہنچانے کا اہتمام کیا اور انھیں بتایا:

> ''ہم مسلمان ہیں۔ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کے مقتضیات میں سے یہ بھی ایک مقتضا ہے کہ پوری زندگی صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی ہو۔ پچرنگی، چورنگی زندگی تو درکنار دورنگی زندگی بھی دعویٰ ایمان کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ ہمارے نزدیک یہ بات بہروپیے پن سے کچھ کم نہیں ہے کہ ہم ایک طرف تو خدا اور آخرت، وحی اور نبوت کو ماننے کا دعویٰ کریں اور دوسری طرف دنیا کے رہ نما کے پیچھے چلیں۔ ایک طرف تو ہم خدا کی شریعت پر ایمان رکھیں اور دوسری طرف وہ طریقہ ہائے زندگی اپنائیں، جو آخرت فراموشی اور مادہ پرستی کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف ہم مسجد میں جا کر نماز پڑھیں اور دوسری طرف مسجد سے نکلتے ہی اپنے گھر کی زندگی میں، اپنے لین دین میں، اپنے سیاسی کاموں میں، اپنے دنیوی معاملات میں خدا اور اس کی شریعت کو بھول جائیں اور پھر کہیں اپنے نفس کی، اپنی برادری کے رسم و رواج کی، اپنی سوسائٹی کے طور وطریق کی، کہیں خدا سے پھرے ہوئے حکمرانوں کی اور کہیں ائمہ کفار کی ہدایتوں کی پیروی میں

کام کرنے لگیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ نہ انصاف کی نظر میں، اور نہ دین کی نظر میں۔ اس لیے کہ ہم ایک نظام زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسرے کسی بھی نظام زندگی سے وفاداری دوغلا پن کہلائے گا۔''

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان کسی نسلی، لسانی یا جغرافیائی قوم کا نام نہیں ہے جو اپنے دنیوی مفادات وحقوق کے لیے دوسری قوموں سے کش مکش کرتی ہو یا دوسری قوموں کے حقوق غصب کرنے کی فکر میں رہتی ہو۔ وہ تو دراصل اس جماعت یا امت کا نام ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے دین اسلام کی نمایندہ ہے۔ اس دین پر خود عمل کرنا، اس دین کی دنیا کو دعوت دینا، اس دین کا نمونہ بن کے دنیا کو دکھانا اور اسے دنیا میں قایم کرنا اس کی زندگی کا مشن ہے۔

اسی لیے مولانا کا مسلمانوں سے کہنا یہ ہے:

''آپ صرف اتنا کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے خدا کو اور اس کے دین کو مان لیا ہے۔ دین صرف یہی نہیں ہے کہ آپ خدا پر، فرشتوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں یا صرف نماز پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں یا نکاح وطلاق اور پرسنل لا وغیرہ کے معاملات میں اسلامی شریعت کے احکام پر عمل کرلیں۔ بلکہ آپ کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ آپ امت وسط ہونے کا ثبوت فراہم کریں اور خدا کی رضا کے لیے آپ اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں جن کو حق کہتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان سے اسلام کی صداقت کے گیت نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے ہماری زندگی میں اسلام کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کرے اور دیکھے کہ اس دین کے ماننے والے کیسے اچھے انسان ہوتے ہیں، یہ دین کیسی اچھی سوسائٹی قایم کرتا ہے، اس دین پر عمل کرنے والوں کی تہذیب اور تمدن کتنا ستھرا اور بہترین ہے تاکہ دوسرے بھی اسے اپنانے کی طرف مائل ہوں۔'' (شہادت حق ص: ۵۰)

گویا مولاناؒ نے ملت اسلامیہ ہند کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ جب وہ دنیا میں اللہ کے

دین کے داعی ہیں تو پھر ان کو چاہیے کہ:

- ان کا ظاہر و باطن ایسا ہو جیسا کہ داعیِ حق کا ہوتا ہے۔
- برائی مٹانے اور بھلائی پھیلانے کے نصب العین پر ان کی نظر ہر وقت جمی رہے۔
- اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قایم کرنے کی کوشش کی جائے اور اپنا پورا زور اس میں لگا دیا جائے کہ یہ حدیں ٹوٹنے نہ پائیں۔
- کوئی پالیسی، کوئی سیاست، کوئی طرز تمدن و تہذیب، کوئی طریق معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہ کیا جائے خواہ وہ اجتماعی حیثیت میں ہو یا انفرادی حیثیت میں۔ مولانا کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں کہ تم بہترین امت ہو اس لیے اپنے منصب کے شایان شان کام کرو تا کہ آخرت کی باز پرس سے بچ سکو، اور دوسری طرف وہ دنیا میں بسنے والی قوموں کو دعوت دیتے ہیں کہ اسلام کی دولت مسلمانوں کی جاگیر نہیں ہے بلکہ خالق کائنات کی طرف سے بنی نوع انسان کے لیے ایک نعمت ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص نسل یا قوم یا خطہ سے نہیں ہے بلکہ وہ ہر قوم کا دین ہے بلکہ پوری کائنات کا دین ہے۔ کیوں کہ وہ اس کائنات کے خالق نے انسانوں کی بھلائی کے لیے پسند کیا ہے اس لیے تم اس کو اپنانے میں بخل سے کام نہ لو۔

عیسائیوں نے صلاح الدین ایوبی کی جنگوں کے بعد سے اسلام کے خلاف عجیب عجیب ڈھنگ سے پروپیگنڈے کیے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور یہ کہ مسلمانوں کے جہاد کے سامنے نہ بوڑھوں کو امان ہے نہ بچوں کو اور نہ عورتوں کو۔ ان باتوں کا مقصد صرف اسلام کو بدنام کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں خاصے کام یاب بھی ہوئے۔ تمام لوگوں کی بات تو الگ رہی خود مسلم مفکرین تک ان سے مرعوب تھے لیکن مولاناؒ نے احساس شکست کے اس پردے کو ''الجہاد فی الاسلام'' لکھ کر تار تار کر دیا اور اسلام کے اعلیٰ و ارفع اصول حیات کو واضح شکل میں پیش کر کے اور جہاد کی حقیقت کو تفصیل سے بتا کر مغربی مفکرین کی بے جا تنقیدوں کی قلعی کھول دی۔ انھوں نے آج کے طاغوتی ماحول کی جاہلیت پر تعمیری تنقید کر کے بتایا کہ اسلام کن حالات میں جہاد کی

اجازت دیتا ہے اور یہ کہ:

"یہاں کسی انسان سے دشمنی نہیں ہے بلکہ دشمنی جو کچھ بھی ہے وہ فساد سے ہے، بداخلاقی سے ہے، اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنی فطری حد سے تجاوز کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہیے، جو فطرت اللہ کے لحاظ سے اس کا نہیں ہے۔" (تفہیمات ص: ۷۰)

یہ دور بڑا نازک تھا۔ شیطان کی ذرّیت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، اس نے خدا اور مذہب کے خلاف عام بغاوت کا جذبہ ابھار دیا تھا اور ایسے مباحث چھیڑ دیے تھے جن کا عام زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سائنس دانوں کے ہاتھوں میں بھاپ کی طاقت کیا آئی کہ ہر فلسفی، ہر ادیب، ہر مفکر الحاد کی تبلیغ کو اپنا فرض منصبی سمجھ بیٹھا۔ ڈارون نے کہنا شروع کیا کہ انسان بندر سے ترقی کر کے اس منزل تک پہنچا ہے اور اس کی موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہے۔ وہ اپنے اعمال وتصرفات کے بارے میں خود مختار ہے خواہ سیاہ کرے یا سفید خدا کا اس کائنات میں کہیں وجود نہیں ہے، اس لیے کسی خوف کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک دوسرے مفکر فرائڈ نے جنسی بے راہ روی کی وکالت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان ننگا پیدا ہوا ہے اس لیے اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھکنا، شرم وحیا کو بار بار درمیان میں لانا غیر فطری عمل ہے۔ مرد عورت کو کھلے طور پر آزادی کے ساتھ اپنے جذبات کی تسکین کرنے میں کچھ حرج نہیں۔

ایک تیسرے مفکر مارکس ہیں جو ان سے بھی آگے کی کوڑی لائے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ مذہب ایک ڈھکوسلہ ہے۔ خدا، رسالت، آخرت اور کتاب یہ سب فرضی چیزیں ہیں۔ اصل مسئلہ انسان کے پیٹ کا ہے۔ ہمیں اپنی تمام کوششیں اقتصادی معاملات پر مرکوز کرنی چاہئیں اور سرمایے داروں سے زبردستی ذولت چھین لینا چاہیے کیوں کہ انھوں نے مزدوروں کا خون چوس کر اپنی تجوریاں بھری ہیں۔

مولانا موصوف نے ان سب نظریات کے خلاف سائنٹیفک طریقے سے قلمی جہاد شروع کیا اور نہایت مدلل طریقے سے دہریت، الحاد اور اشتراکیت کے نظریات پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ مادہ پرستانہ تہذیب کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں اور عملی طور پر ان تحریکوں کے مقابلے میں

تحریک اسلامی کو دیوار چین بنا کر کھڑا کر دیا۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ساری دنیا میں اہل حق کا قافلہ الحاد و مادیت سے نبرد آزما ہے۔ مسلم نوجوانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ایمانی ولولے اور اعلائے کلمۃ الحق کے جذبے سے سرشار ہو کر آگے بڑھ رہا ہے۔

یہ سب مولاناؒ کی تحریروں کا اثر ہے۔ انھوں نے غیر معمولی حکمت اور حقیقت پسندی سے کام لے کر اجتہاد کا حق ادا کر دیا۔ ان کا لٹریچر جو آدمی بھی ایک بار پڑھ لیتا ہے اسے اسلام کی عظمت کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور اسی سے مولانا کی دور اندیشی، ژرف نگاہی، حق پسندی وحق شعاری اور خداداد فراست کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

تفہیم القرآن اور مولانا مودودیؒ

قرآن اللہ رب العزت کی آخری کتاب ہے۔ یہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ بنی نوع انسان اس سے زندگی کے معاملات میں رہ نمائی حاصل کریں۔ یہ حریت وصداقت کا ایسا سرچشمہ تھا، جس کے فیض سے صحابہ کرامؓ نے سیراب ہو کر جاہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار چھین لیا اور اسلام کا جھنڈا ہر بلند و پست پر لہرا دیا۔ لیکن بعد کے زمانے کے لوگ قرآن کی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اور اس کلامِ الٰہی کو صرف چومنے سینے سے اور آنکھوں سے لگانے یا کبھی کبھار تلاوت کرنے کی چیز سمجھا۔ یا بہت سے لوگوں نے اس سے جھاڑ پھونک کا کام لیا اور بس۔

لیکن مولاناؒ نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ تو انسانوں کے مالک اللہ رب العزت کی طرف سے ہدایت کا چراغ ہے، سراج منیر ہے اور میزان حق ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس کتاب کی اصل حیثیت کو سمجھیں اور اپنے اعمال، کردار، عقائد اور رسم و رواج کو اس کی تعلیم کے مطابق ڈھالیں، جس سے دنیا اور آخرت میں اللہ کی رضا کے حق دار ہو سکیں۔

یہ باتیں سمجھانے کے لیے مولاناؒ نے قرآن کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے نام سے مرتب کی۔ اس سے پہلے بعض مفسّرین نے قرآن کی جو تفسیر و تشریح کی تھی وہ عام لوگوں کے ذہن سے بہت بلند تھیں اور ان سے صرف عالم لوگ ہی مستفید ہو سکتے تھے لیکن مولاناؒ کی تفسیر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام فہم اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر قاری کے ذہن میں قرآن پاک کے نزول کا مقصد بیٹھتا چلا جاتا ہے۔ ہماری زندگی میں جو مضحکہ خیز تضاد پیدا ہو گیا تھا

وہ مٹنے لگتا ہے۔ مذہب کا تعلق زندگی کے چلتے ہوئے کاروبار سے، لین دین سے، علوم وفنون سے اور سیاست و معاشرت سے جڑ جاتا ہے اور ہمارے اندر اپنی سیرت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یہ کتاب دل و دماغ دونوں کو بیک وقت دعوت فکر دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ اسلام ایک زندہ تحریک اور روزمرہ کے معاملات میں رہ نمائی کرنے والا دین ہے۔

یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا۔ آج زمانہ بہت آگے جا چکا ہے اس دور کی ضروریات میں یہ کیا رہ نمائی کرے گا؟ مولاناؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ”جس چیز کی بنا پر قرآن کو اللہ کا کلام ماننا پڑتا ہے وہ یہی تو ہے کہ ایک خاص ملک اور معاشرے میں اسلامی تحریک برپا کرنے کے لیے اس میں احکام اور اصول بیان کیے گئے ہیں لیکن ان میں ایسی جامعیت ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں یکساں قابل عمل ہیں اور اگر آدمی ان کو سمجھ لے تو ہر زمانے کے حالات پر ان کو منطبق کر سکتا ہے۔ یہ علم اور یہ بیان اللہ کے کلام کے سوا دنیا کے کسی اور کلام میں ملنا ممکن نہیں ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس نے مجھے اس کے کلام الٰہی ہونے کا قائل کیا ہے۔ اسی سے میں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ لوگوں کو دین بہ راہِ راست قرآن پاک کے ذریعے سمجھایا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اسلام ایک تحریک ہے اور اس تحریک کا مقصد اللہ کے دین کو اللہ کی زمین پر عملاً قایم کرتا ہے اور قرآن اس دین کا لائحہ عمل ہے۔ اللہ رب العزت جو تمام انسانوں کا مالک و خالق ہے۔ اس نے اپنا منشا اپنے کلام میں بیان فرما دیا ہے اگر انسان اس کو اچھی طرح سمجھ لے تو اس کی دنیا و آخرت سنور سکتی ہے۔“

ایک مدت سے مسلمانوں میں مذہب کا ایک جامد تصور چلا آ رہا تھا۔ اللہ کی ہدایت کا سب سے مستند اور محفوظ سرچشمہ قرآن تھا اور اسی سے وہ غافل تھے۔ وہ قرآن سے زندگی کے معاملات میں رہ نمائی حاصل کرنے کے بہ جائے صرف اس سے جھاڑ پھونک کا کام لے رہے تھے

اور اس طرح اسلام میں پچھلی کئی صدیوں سے اجتہاد کی راہ مسدود ہوگئی تھی۔ مولاناؒ نے اس دور میں تلاش و تحقیق کا دروازہ کھولا، جس سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ بہت زیادہ متاثر ہوا اور جس کے نتیجے میں احیائے اسلام کی عظیم تحریک مشرق مغرب تک پھیلتی چلی گئی۔

مولانا کی دوسری تصنیفات اور قلمی جہاد

اس کے علاوہ مولاناؒ نے سود، پردہ اور تفہیمات جیسی بلند پایہ کتابیں لکھ کر شیطان کی ذریّت کے خلاف قلمی جہاد شروع کیا۔ مولاناؒ کی دوررس نگاہ نے موجودہ معاشرے کے چہرے سے نمایشی نقاب ہٹاتے ہوئے بتایا کہ:

"آج پوری دنیائے انسانیت دو چیزوں کی وجہ سے تباہی کے قریب آتی جارہی ہے: ایک سودی کاروبار اور دوسرے خاندانی منصوبہ بندی۔ ان دونوں باتوں نے انسان کو بہت ہی گھٹیا حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک نے اس کو مادیت کا غلام بنایا اور دوسری نے جنسی خواہشات کا نتیجہ جس کا نتیجہ بے پردگی و بے حیائی کی شکل میں سامنے آرہا ہے۔ جن کے اثرات مسلم ممالک پر بھی شدت کے ساتھ پڑ رہے ہیں اور ان میں ایک انتشار اور شکست خوردگی کی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلم معاشرے کی قیادت ایک مدت سے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے، جو اسلام کو ماننے کے باوجود اپنے آپ کو اسلام کی حدود میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب جب تک گاڑی چلانے والی لیڈر شپ پھر دین دار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں آئے گی اس وقت تک یہ حالت نہیں بدل سکتی اور خدانخواستہ اگر اب بھی ایسی مخلص اور اسلامی لیڈر شپ میسر نہ آئی تو ہم سب کو بہت ہی برا دن دیکھنا پڑے گا۔"

اسی لیے مولانا مرحوم عمر بھر مسلمانوں سے کہتے رہے کہ نہ تو وطنی تحریکوں کے دلدل میں پھنسیے اور نہ سیاسی تانے بانے پورنے میں اپنا وقت ضائع کیجیے بلکہ اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراط مستقیم ہے۔ مولانا اپنے عہد کے بڑے روشن خیال اور جدید ذہن کے انسان تھے۔ انھوں نے اسلام کے نظام کو پیش کرنے میں بڑی بالغ نظری سے کام لیا ہے۔ نئے دور کے بدلتے ہوئے حالات اور اس دور کے سائنس کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے دین کی تشریحات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ زمانے کے جدید رجحانات سے پوری طرح باخبر تھے۔

ساتھ ہی انھوں نے اسلامی فکر کے نئے زاویے دریافت کیے اور دنیا کو بتایا کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے میں کس طرح مکمل رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ مولاناؒ کی ان کوششوں کو دیکھ کر ہی مصر کے مشہور اسلامی مفکر محمد قطب صاحب نے فرمایا تھا:

''مولانا مودودیؒ نے اسلام کے صحیح نظریات کو غیر اسلامی ملاوٹوں سے پاک کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ دنیا میں مسلمان ان سے ہر جگہ استفادہ کر رہے ہیں اور نوجوان نسل اس سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ آپ کی یہ عظیم خدمت اسلامی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہے۔''

خود ہمارے ملک کے ایک بڑے مشہور مفسر قرآن اور عالم دین مولانا ابوالکلام آزاد مولاناؒ کے قلم کی صداقت اور کلمۂ حق کی جدوجہد کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

''مولانا گلشن حق کے ان لالہ و سنبل میں سے ہیں جن کی خوشبو سدا بہار ہمیشہ متعفن باطل کو مغلوب کر کے طالبان حق کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہتی ہے اور جسے فنا نہیں۔''

پاکستان کے ایک مشہور ایڈوکیٹ اور قانون داں اپنی ایک گزری داستان سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ سوئزرلینڈ کی ایک تقریب میں مجھ سے ایک بھارتی مسلمان نے پوچھا کہ کیا آپ مولانا مودودیؒ کو جانتے ہیں۔ میں نے کہا الحمدللہ میں انھیں جانتا ہوں۔ ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''عنایت ہوگی اگر میری طرف سے مولانا تک یہ بات پہنچادیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایک آدمی کی شہادت کوئی اہمیت رکھتی ہے تو قیامت کے دن میں اللہ کے حضور میں اس امر کی شہادت دوں گا کہ جس شخص نے میری زندگی کا دھارا بدل دیا وہ مولانا مودودیؒ ہیں۔

(مولانا مودودیؒ اور تفہیم القرآن ص:۱۸)

یہ اور اس قسم کی سینکڑوں بیانات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ مولانا کے لٹریچر پڑھ کر غیر ملکوں میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جو ہمارے ملک کے مشہور عالم دین ہوئے ہیں ایک مرتبہ مولاناؒ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا:

''آپ اس دور کے متکلم اسلام اور ایک بلند پایہ عالم دین ہیں۔ یورپ

سے الحاد و دہریت کا سیلاب جو ہندستان میں آیا تھا قدرت نے اس کے سامنے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا جو خود یورپ کے قدیم وجدید خیالات سے نہایت اعلیٰ درجہ کی کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے پھر اس کے ساتھ ہی قرآن وسنت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تسلی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں نے اس شخص کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں اور یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مودودی صاحب سے ہندستان اور عالم کے مسلمانوں کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔''

(ردفتنہ ص:۱۱۹ از ڈاکٹر انور علی بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۱۷، ص ۳۴۸)

چناں چہ وہ توقعات آج کے دور میں پوری ہوئی جارہی ہیں۔ مختصر یہ کہ مولانا مودودیؒ نے لوگوں کو بتایا کہ:

۱- ''اسلام'' مسلمانوں کی میراث نہیں ہے بلکہ یہ دین حق ہے اور ہوا، پانی اور روشنی کی طرح دنیا کے ہر انسان کے لیے عام ہے۔ اس لیے آگے بڑھ کر اسے ہر شخص کو اپنانا چاہیے۔

۲- اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ آج کے جملہ درپیش مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔

۳- اسلام رسوم وقیود کی تنگنائیوں میں قید نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم تمدن، ایک اعلیٰ تہذیب اور ایک ہمہ گیر انقلاب ہے۔

مولانا مودودی علیہ الرحمہ کا عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ:

۴- آپ نے تعلیم یافتہ طبقہ اور متلاشیِ حق کے لیے اپنی تفسیر قرآن (تفہیم القرآن) کے ذریعے قرآن فہمی کا دروازہ کھول دیا ہے۔

۵- مسلمان ملت کی مرعوبیت کو ختم کرنے کا فرض انجام دیا ہے۔

۶- مستشرقین یورپ نے قرآن کریم اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں جو زہر افشانی کی تھی مولاناؒ نے ناقابل تردید شواہد اور دلائل کے ذریعے ان کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔ نیز تہذیب حاضر کی فسوں کاری کے طلسم کو تار تار کردیا ہے۔

۷- ''فتنہ انکار حدیث'' کا علَم بلند کرنے پر حدیث کی معتبریت اور حجیت کو محکم دلائل و براہین سے ثابت کیا۔

۸- مسلم معاشرے میں جو اعتقادی اور عملی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں ان کو دور کرنے کے لیے اس کا رشتہ قرآن مجید سے جوڑ دیا ہے۔

۹- قرآن پاک کے مضامین کا ایسا جامع اور نہایت آسان انڈیکس مرتب کردیا ہے، جس سے اس کی تعلیمات وہدایات تلاش کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

۱۰- یہ سہرا بھی مولانا کے سر بندھتا ہے کہ آج دنیا بھر میں ان کا لٹریچر پڑھ کر اسلامی تحریکیں احیائے اسلام کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

۱۱- مولانا نے اپنی پوری زندگی شخصیتوں کے بت توڑے اور بعض شخصیتوں کے ساتھ چپکے ہوئے مافوق الانسانی تصورات کو کھرچا تو کتنے بھی عقیدت مندوں کو یہ بات شاق گزری اور انھوں نے مولانا پر بزرگوں کی توہین کے الزامات لگا کر بدنام کرنے کی کوشش کی۔ دارالعلوموں سے فتوے جاری کیے گئے۔ عوام کو مولانا اور ان کی تحریک کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ ان پر مہدی موعود بننے کا الزام تھوپا گیا اور آخر میں تو قادیانی مسئلہ کی آڑ لے کر تختہ دار پر پہنچانے کا فیصلہ بھی صادر ہوگیا لیکن یہ مولانا کا حوصلہ تھا کہ سب کچھ سہتے رہے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اللہ نے ان کو عقل سلیم کے ساتھ غیر معمولی جرأت و ہمت کے اوصاف سے بھی نوازا تھا۔ چناں چہ انھوں نے سخت سے سخت مراحل میں اولوالعزمی کا ثبوت دیا۔ وہ راسخ الاعتقادی اور صداقت کی ایسی چٹان تھے کہ جس پر مخالفت کی اٹھنے والی لہریں ٹکراتی رہیں مگر وہ اپنی آخری سانس تک یقین وعمل کی پختگی اور عالمانہ بصیرت سے دعوت دین کا کام کرتے رہے۔